فکر و نظر

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ

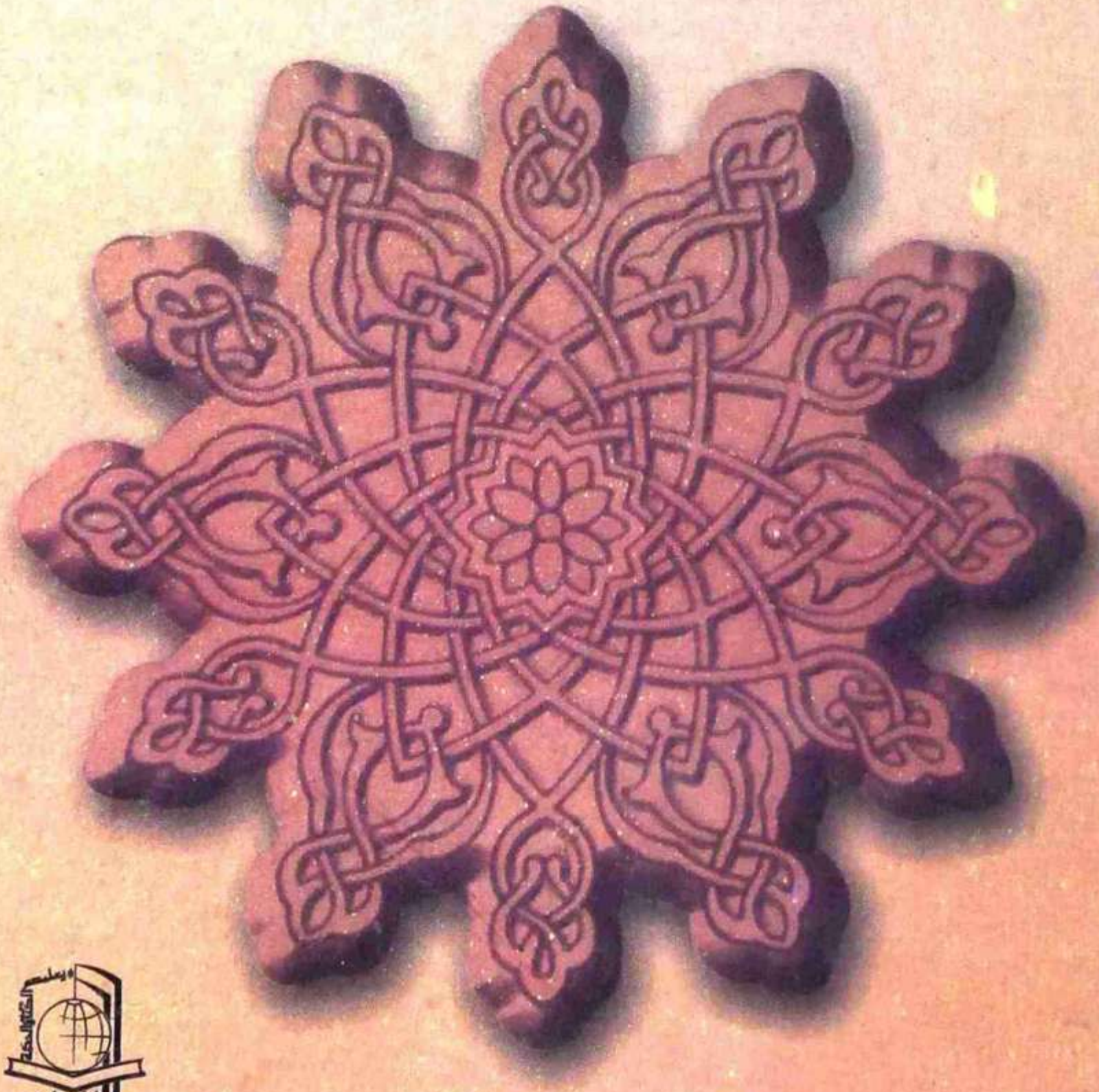

دار الملاک

ACC No.............Date..........
Section.............Status..........
D.D. Class..........................
NAJAFI BOOK LIBRARY

بسم الله الرحمن الرحیم

فکر و نظر

عقیدتی، سیاسی اور اجتماعی موضوعات پر

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ

کے چند انٹرویوز اور تقاریر کا مجموعہ

یکے از مطبوعاتِ

دار التقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳- کراچی ۷۴۶۰۰- پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

DARUSSAQLAIN
P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : فکر و نظر

اثر : آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ (لبنان)

ترجمہ : سید سعید حیدر زیدی

ناشر : دارالثقلین

طبع اول : جمادی الثانی ۱۴۲۲ھ ' اگست ۲۰۰۱ء

طابع : ایس ' ایم ' پرنٹرز

قیمت : ۴۰ روپے

فہرست

☆ قرآنِ مجید، دستورِ زندگی ــــــــــ ۹

قرانِ مجید، دستورِ زندگی ــــــــــ ۱۰

☆ دین، معاشرہ اور حکومت ــــــــــ ۳۵

دین، معاشرہ اور حکومت ــــــــــ ۳۶

☆ حکومتِ اسلامی، شوریٰ اور جمہوریت ــــــــــ ۶۳

حکومتِ اسلامی، شوریٰ اور جمہوریت ــــــــــ ۶۴

اسلام اور حکومت ــــــــــ ۶۴

معاشرہ اور حکومت ــــــــــ ۷۲

فقیہ اور معاشرہ ــــــــــ ۷۶

نظریہ اور زمینی حقائق ــــــــــ ۷۸

☆ تہذیبوں کے درمیان مکالمہ ــــــــــ ۸۱

تہذیبوں کے درمیان مکالمہ ــــــــــ ۸۲

☆ تفاہم باہمی کی ضرورت ــــــــــ ۹۹

تفاہم باہمی کی ضرورت ــــــــــ ۱۰۰

☆رسولِ اکرمؐ کے بعد اسلام کی قیادت ——— ۱۰۷
رسولِ اکرمؐ کے بعد اسلام کی قیادت ——— ۱۰۸
تاریخ پر نقد و تحلیل ——— ۱۱۵
مسئلہ خلافت کے بارے میں تحقیق ——— ۱۱۷
☆اسلام اور عورت کا معاشرتی کردار ——— ۱۲۳
اسلام اور عورت کا معاشرتی کردار ——— ۱۲۴
فکرِ اسلامی میں عورت کا مقام ——— ۱۲۵
اسلام کے سیاسی معاشرے کی بنیادیں ——— ۱۲۶
عدالت کا قیام مرد و زن کی ایک مقدس ذمے داری ——— ۱۲۷
اسلامی سیاست کے میدان میں عورت کا حق ——— ۱۲۸
اخلاقی اقدار اور مرد و زن ——— ۱۳۰
عورت اور قیادت ——— ۱۳۱
قرآن مجید میں عورت کی سربراہی کا ذکر ——— ۱۳۲
ایک متحرک سماج میں مرد و زن کی تصویر ——— ۱۳۶
ظالم حکمرانوں کے مقابل عورت کا کردار ——— ۱۳۷
مرد و زن دونوں اسلامی اقدار کے مخاطب ہیں ——— ۱۳۹
عورت کی فکری و ذہنی صلاحیت ——— ۱۴۰
معاشرہ اور بگاڑ ——— ۱۴۲
بگاڑ کے مقابل ایک مسلمان کا کردار ——— ۱۴۲

☆☆☆

عرضِ ناشر

وقت کبھی نہیں ٹھہرا، مسلسل رواں دواں ہے اور اپنے ساتھ تاریخ جغرافئے انسانوں کی بود وباش، عادات واطوار اور اندازہائے فکر کو بھی پیہم بدلتا رہا ہے۔

اسلام، انسان کی ہدایت و رہنمائی اور اسکی دنیا و آخرت کی سرخروئی کے لئے خدا کے پسندیدہ ضابطے کے عنوان سے نازل ہوا ہے، جو دو بنیادی مصادر (Sources) قرآن اور سنت (یعنی معصوم کی گفتار، کردار یا کسی عمل پر ان کی تائید) پر مشتمل ہے۔

نزول قرآن، پیغمبر اسلامؐ کی حیات مبارک ہی میں تیئس برس کی مدت میں مکمل ہو گیا تھا۔ اور اس کے شارح اور مفسر رسول کریمؐ اور (ہمارے عقیدے کے مطابق) ائمہ معصومینؑ مدت دراز تک اس کے ساتھ رہے۔ معصوم کی غیبت کے بعد مسلمان قرآن کریم کے بے عیب اور معصوم فہم سے محروم ہو گئے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وقت رواں دواں ہے، تاریخ پیہم سفر میں ہے، حالات و شرائط ہمیشہ تبدیلیوں کی زد پر ہیں، نئے مسائل، نئی مشکلات، نئے سوالات مسلسل سامنے آرہے ہیں جن کے متعلق واضح ہدایات اور ان کا حل بظاہر قرآن کریم اور میسر سنت معصومین میں نظر نہیں آتا ہے۔ اس صورتحال میں شرع کا موقف جاننے کے لئے اہل اسلام نے اجتہاد کا راستہ اپنایا، جس کے ذریعے علمائے دین، فقہا اور مجتہدین نئے حالات میں شرعی حکم معلوم کرتے ہیں۔ اس طرح اسلام ہر دور کے مطابق (update) رہا

اور ابدی اور دائمی دین کے بطور تسلیم کیا گیا۔

البتہ ایک طویل عرصے تک مسلمانوں کی سیاست اور اجتماعیت سے اسلام کی دوری اور مسلمانوں میں دین کے بارے میں مغربی طرزِ فکر کے رواج کی بنا پر دین اسلام کو بھی محض بندے اور خدا کے باہمی تعلق اور چند رسوم ورواج اور مخصوص عبادات کی انجام دہی تک محدود سمجھ لیا گیا اور اسکے زیر اثر اجتہاد بھی عبادات اور معاملات کے محض فردی پہلو میں منحصر ہو کے رہ گیا اور دین کے اجتماعی' سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کے سلسلے میں اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن انیسویں صدی میں عالم اسلام میں' اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار' مسلمان معاشروں میں دین کے نفاذ کا عزم رکھنے والے مفکرین کی مساعی کے نتیجے میں اسلام کی سیاسی' اجتماعی اور معاشرتی تعلیمات پھر زیر بحث آنے لگیں' نئے سیاسی اور سماجی حالات کے لئے اسلامی موقف کا اظہار ہونے لگا' بالخصوص ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد شیعہ علما' فقہا اور مجتہدین نے سماجی اور اجتماعی موضوعات کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر قابل قدر تحقیقی کام سرانجام دیئے اور اسلام کو ایک ایسے دین کے بطور پیش کیا جو اجتماع' معاشرت' معیشت اور سیاست میں پاکیزہ' ارفع' واضح اور دوسرے تمام اجتماعی مکاتب سے کہیں بلند تر تعلیمات پر مشتمل ہے۔

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ' جن کا تعلق لبنان سے ہے اور جو عراق کی تحریک اسلامی کے قائد شہید آیت اللہ سید محمد باقر الصدرؒ کے رفقا میں سے ہیں' انہیں ایسے ہی مفکر' علما اور مجتہدین کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب عقیدتی' سیاسی اور اجتماعی موضوعات پر آپ کے چند انٹرویوز اور تقاریر پر مشتمل ہے جنہیں اسلامی جمہوریہ ایران میں شائع ہونے والے مختلف دینی اور علمی جرائد سے اکٹھا کیا گیا ہے' یہ انٹرویوز اور تقاریر اپنے اندر غور و فکر کا بہت سا سامان لئے ہوئے ہیں۔ دور جدید کے تناظر میں اسلام کی اجتماعی اور سیاسی تعلیمات' اور مختلف عقیدتی سوالات کے جواب جاننے کے خواہشمند قارئین' اس مجموعے سے یقیناً مستفیض ہوں گے۔ پڑھنے والوں کی آراء و تجاویز کا ہمیشہ ہمیں انتظار رہتا ہے۔ والسلام

قرآنِ مجید، دستورِ زندگی

یہ انٹرویو حوزۂ علمیہ قم المقدس، ایران سے شائع ہونے والے قرآنی مجلّے «بینات» کے شمارہ نمبر ۱۸ اور ۱۹ سے لیا گیا۔

قرآنِ مجید دستورِ زندگی

سوال : قرآن کریم کی روح پرور اور زندہ تفسیر کے لئے کس بات پر توجہ ضروری ہے ؟

جواب : ہمارے خیال میں، قرآن کریم کی تفسیر اور اس کے مطالعے کے دوران، اہم ترین بات یہ ہے کہ انسان خود کو ایک ایسی کتاب کے روبرو خیال کرے، جو اسکی پوری زندگی پر اثرانداز ہونے والی ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات میں (ان کی اس رنگارنگی اور تفاوت کے باوجود جو زمانے کے نشیب و فراز کا نتیجہ ہوتے ہیں) قرآن مجید سے روشنی حاصل کرے اور زندگی کے لئے اپنے راستے اور لائحۂ عمل کو اسی کتابِ ہدایت میں تلاش کرے۔

کیونکہ قران مجید کسی خاص زمان و مکان اور ان مخصوص افراد کے لئے نازل نہیں ہوا ہے جو نزولِ وحی کے زمانے میں زندگی بسر کیا کرتے تھے، بلکہ خداوند متعال نے قران کریم کو ایک نور کی مانند، تمام بشریت کے لئے نازل کیا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے : قرآن شب و روز، اور خورشید و ماہ کے ہمراہ اور ہمدم ہے۔ یعنی ہر دور اور ہر خطۂ ارض کے لئے ہے۔ لہذا قرآن کریم کے بارے میں ہمارا فہم و ادراک جاری اور متحرک فہم و ادراک ہو، خواہ زندگی کے حالات صلح کے ہوں یا جنگ کے، خواہ ہمیں درپیش مسائل معاشرتی ہوں، اقتصادی یا سیاسی۔

قرآن مجید' دوسری آسمانی کتابوں کی مانند یکبارگی نازل نہیں ہوا ہے' بلکہ رفتہ رفتہ نازل ہوا ہے تاکہ لوگ تعلیماتِ وحی کی روشنی میں اپنی زندگی کے معاملات اور مسائل کا حل و فصل سیکھ سکیں۔

آیاتِ قرانی کے اسبابِ نزول بیان ہوئے ہیں تاکہ بتایا جاسکے کہ قرآنِ مجید زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے۔ ابتدائی زمانے کے مسلمان' اپنی زندگی کی ضرورتوں اور درپیش مسائل کے سلسلے میں قرآنِ مجید سے رہنمائی لیا کرتے تھے۔ ہم بھی فقط اسی صورت میں قرآن مجید کا واقعی اور کارآمد فہم حاصل کر سکتے ہیں جب اپنے مقاصد اور تمناؤں کا اسی کے ذریعے تعین کریں اور زندگی کے حقائق کو قرآنی فہم کی اساس پر شکل و صورت دیں۔

اہل بیتؑ بھی' اسی انداز سے قرآن کا تعارف کراتے تھے' جیسا کہ امام رضاؑ سے نقل ہوا ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا: کیا وجہ ہے کہ قرآنِ مجید سے جتنا بھی درس لیا جائے اور اس پر جتنی بھی گفتگو کی جائے' اس کے مفاہیم کی تازگی اور شادابی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: اسکی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالی نے قرآن کو ہر زمانے' ہر علاقے اور تمام بشریت کے لئے نازل کیا ہے۔ لہذا یہ ہر دور کے لئے نیا اور ہر قوم و ملت کے لئے تازہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی بھی نسل اور معاشرہ' اپنی حاجات' مطالبات اور رہنمائی کے لئے قرآن مجید میں جستجو کرے وہ ان کا جواب پالیتا ہے۔

قرآنِ کریم سے استفادے کے سلسلے میں ائمۂ معصومینؑ کی یہی روش اور طریقہ کار تھا۔

سوال: قرآن کریم کے کون سے موضوع یا موضوعات کے بارے میں تحقیق و تفسیر کو ترجیح دی جانی چاہئے؟

جواب: ہمارے خیال میں عقائد' مثلاً توحید' نبوت اور معاد (قیامت) کو اسلامی مفاہیم میں مرکزی کردار حاصل ہے۔ ہمیں قرآن کریم کی روشنی میں (انکا اس انداز سے) مطالعہ اور تحقیق کرنی چاہئے کہ ہم نہ صرف ان کے ظاہر پر توجہ دیں بلکہ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں

ان کے باطن کا بھی جائزہ لیں۔ کیونکہ بسا اوقات ایک آیت کا بیان مجمل ہوتا ہے جبکہ دوسری آیات اسکی عبارتوں کو تفصیل سے بیان اور اس کے اشارات کو آشکارا کرتی ہیں۔

ہمیں عقائد کی خالص اور ستھری تصویر کے حصول کے لئے ہر قسم کے پیشگی فیصلوں سے پرہیز کرتے ہوئے قرآنِ مجید سے رجوع کرنا چاہئے۔ افسوس کہ قرآنِ مجید پر کئے گئے کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنی آراء اور خیالات کو قرآن پر ٹھونسا ہے۔ (ان میں سے بعض لوگوں نے) پہلے فلسفے کا مطالعہ کیا ہے اور پھر اسی فلسفی ذہنیت کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور وہ اسی ذہنیت کے مطابق قرآنی مفاہیم کی تفسیر یا تاویل کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کے تفسیری نظریات کسی مشکل کو حل کرنے کی بجائے خود مشکل ایجاد کرنے کا سبب بنے ہیں۔ نیز ان لوگوں نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے ظواہر کو بھی فراموش کر دیا ہے۔

اس مشکل سے بچنے کے لئے مناسب ہے کہ پیشگی فیصلوں سے ذہن کو خالی رکھ کر' اپنے عقائد قرآنی تعلیمات سے اخذ کریں۔ البتہ عقلانی دقت اور غور و فکر کے ساتھ اور وہ بھی اس عقل سے جو انسانی فطرت اور وجدان کا مقتضا ہے' نہ کہ وہ عقل جس کی بنیاد یونانی فلسفہ ہو (جیسے فیضِ الٰہی کا نظریہ) جس کے اپنے خاص نظریات اور عقائد ہیں۔

اسی بات کے پیش نظر ہم اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے بنیادی عقائد کو قرآنی طرزِ فکر اور اسلوب کے ذریعے ہی قرآن سے حاصل کرنا اور اسی پر ان کی بنیاد اٹھانی چاہئے اس کے برعکس ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے عقائد اور خیالات کو قرآن کریم پر ٹھونسنے لگیں۔

قرآنِ مجید اس درجہ اہمیت کا حامل ہے کہ اکثر حالات میں قرآن کی تفسیر' سنت میں تلاش کرنے کے بجائے' سنت کی قرآن کے ذریعے تفسیر کی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن میں پڑھتے ہیں : انما الخمروالمیسروالا نصاب والازلام رجس من عمل

الشیطان فاجتنبوہ (شراب 'جوا' بت 'پانسہ یہ سب گندے شیطانی اعمال ہیں 'لہذا ان سے پرہیز کرو۔ سورۂ مائدہ ۵ - آیت ۹۰) قرآن مجید کے عام فہم کے مطابق لفظ میسر کے معنی قمار یا جوا لئے جاتے ہیں' جس میں بازی لگائی جاتی ہے۔ اور دوسری طرف جب ہم حدیث پڑھتے ہیں : الشطرنج میسر والنرد میسر تو یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ شطرنج اور نرد از خود حرام نہیں ہیں' صرف بازی لگا کر کھیلنے کی صورت میں حرام ہیں۔ کیونکہ رائے عامہ ان وسائل (یعنی شطرنج اور نرد) سے بغیر بازی لگائے کھیلنے کو جوئے کا نام نہیں دیتی۔

سوال : فہم قرآن میں زمانے 'بالخصوص نزولِ قرآن کے زمانے کے علمی اور تمدنی حالات کا اثر کس حد تک ہے ؟

جواب : زمانہ 'وحی کو محدود نہیں کر سکتا' کیونکہ وحی (قرآن مجید) زمانے سے ماوراء اور تمام ادوار پر محیط ہے لیکن کیونکہ قرآنِ مجید ایک خاص ماحول اور تمدن میں نازل ہوا ہے اس لئے اس خاص ماحول اور تمدن سے واقفیت قرآنی آیات اور زندگی کے حقائق کے بارے میں قرآن کے نکتۂ نظر کو سمجھنے کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہے' ساتھ ہی ساتھ اسکے ذریعے عصرِ نزول کے لوگوں کا فہم ہم پر واضح ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ نزولِ وحی کے اسباب اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیاتِ قرآنی کے معنی سمجھتے تھے اور اسکی روشنی میں اپنے لئے راستے کا انتخاب کرتے تھے۔

البتہ زمانے کے حالات اور اسکے تمدن پر ہمہ گیر توجہ کسی خاص زمانے اور خاص علاقے تک قرآن مجید کو منجمد اور منحصر کر دینے کا باعث نہیں۔ بلکہ ایک واقعے 'دور حاضر تک اسکے تسلسل 'اور جو کچھ اسبابِ نزول کے سلسلے میں کہا گیا ہے 'اسکے سمجھنے کے سلسلے میں پہلا قدم ہے۔

قرآنِ کریم 'زندگی کی حقیقتوں کے بیان پر توجہ دیتا ہے جن کا نمونوں اور مثالوں

کے طور پر اس کتابِ ہدایت میں ذکر کیا گیا ہے' تاکہ ہم ان کی تاسی اور انہیں نمونۂ عمل قرار دے کر قرآنِ کریم کو اپنی زندگیوں میں جاری کریں اور اس سے روشنی حاصل کریں۔ مثلاً آیت قرآن : ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدی من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب والئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون۔ (جو لوگ ہمارے نازل کئے ہوئے واضح بیانات اور ہدایات کو ہمارے بیان کر دینے کے بعد بھی چھپاتے ہیں ان پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۵۹) کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب بالخصوص یہودی ہیں۔ جبکہ ہم اسے صرف اسی مورد میں مختص نہیں کر سکتے اور اگر اس سے اس اختصاص کو ختم کر دیا جائے تو اسے اس جیسے تمام موارد پر عمومیت دی جا سکتی ہے۔

اسی طرح وہ آیت جو پیغمبر اکرمؐ کی جنگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے' جس میں ارشاد ربانی ہے : ھنالک ابتلی المومنون وزلزلو ازلزالا شدیدا (اس وقت مومنین کا باقاعدہ امتحان لیا گیا اور انہیں شدید قسم کے جھٹکے دیئے گئے۔ سورۂ احزاب ۳۳ - آیت ۱۱) یہ آیت دشمن کے بالمقابل ہماری صورتحال پر گفتگو کرتی ہے اور ہماری کمزوریوں پر ہمیں متوجہ کرتی ہے۔

اسی طرح یہودیوں کے دھوکے اور مکر آمیز طریقے بھی' جن کی جانب قرآن مجید میں بارہا اشارہ کیا گیا ہے' ہماری اس حالیہ زندگی میں ہمارے لئے انتباہ ہو سکتے ہیں کہ ہم ان سے درسِ عبرت حاصل کریں اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جائیں جو ماضی کو برا بھلا کہتے ہوئے' اسی گڑھے میں جا گرتے ہیں (جس میں ماضی کے لوگ گرے تھے)۔

قرآنِ کریم کی باطنی تفسیر و تاویل کے ایک معنی اپنی موجودہ زندگی میں قرآن کریم سے ہدایت اور روشنی لینا ہیں۔ جیسا کہ امام محمد باقر علی السلام کا ارشاد ہے : قرآن کا

ظاہر اپنے نزول کے زمانے کے لوگوں پر نظر رکھتا ہے اور اسکا باطن ان لوگوں پر نظر رکھتا ہے جو ان (لوگوں) کے مشابہ اعمال انجام دیتے ہیں۔

سوال : کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں تمام چیزوں کو جمع کر دیا گیا ہے اور وہ ہر سوال کا جواب دیتا ہے اور اس دعوے کے لئے اس آیت کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے' جس میں ارشاد الٰہی ہے : ونزلنا علیک الکتاب تبیا نا لکل شی (اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر شے کو بیان کر دیا گیا ہے۔ سورۂ نحل ۱۶- آیت ۸۹) اس بارے میں آپ کا خیال کیا ہے ؟

جواب : آیت میں کل شی سے مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن مجید میں تمام اسرارِ کائنات اور سیاسی' معاشرتی اور اقتصادی مسائل کی جزیات تک بیان کر دی گئی ہیں۔ کیونکہ انبیاء کو اس مقصد کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن مجید زندگی کے تمام شعبوں میں انسان کی بنیادی ضروریات اور تقاضوں کا جواب دیتا ہے۔

یعنی اگر انسان اسلام کے کلی اصولوں کے زیر سایہ زندگی بسر کرے تو اس نے حق کا راستہ اپنایا ہے۔ مثلاً قرآن کریم عقلی غور و فکر اور تجربی دریافتوں کی قدر و قیمت کا قائل ہے۔ اب اگر انسان ان دو منابع کی بنیاد پر فکری اور عملی کام انجام دے تو اس نے غلط راستے کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ اسی طرح عدل کا مسئلہ ہے جو مطلقاً قرآن کا مطلوب ہے۔

روایات بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہیں' جیسے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں : فی القرآن نبا ما قبلکم و خبر ما بعد کم و حکم ما بینکم (قرآن میں تم سے پہلے کی خبریں' تمہارے بعد کے واقعات اور تمہارے مابین حالات کے لئے احکام پائے جاتے ہیں۔ نہج البلاغہ - کلمات قصار ۳۱۳) نیز فرماتے ہیں : الا ان فیه علم مایاتی والحدیث عن الماضی ودواء دائکم ونظم ما بینکم (یاد رکھو کہ اس میں مستقبل کا علم ہے' اور ماضی کی داستان ہے' تمہارے درد کی دوا ہے' اور تمہارے امور کی

تنظیم کا سامان ہے۔ نہج البلاغہ - خطبہ ۱۵۶) ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اعتقاد' قانون اور اخلاق کے عنوان سے جو کچھ بھی انسان کے لئے ضروری ہے اسے قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے۔

سوال : قرآنِ کریم کی سائنسی تفسیر اور اسکی حدود کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ؟

جواب : سائنسی نتائج کی بنیاد پر قرآن مجید کی تفسیر درست نہیں۔ کیونکہ سائنسی نظریات میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں اور وہ ظن و تخمین اور ناقص تجربے پر استوار ہوتے ہیں۔ ایسی تفسیر جو ان نظریات پر مبنی ہو وہ متزلزل اور ناپائیدار ہو گی اور اعتماد و اعتبار کے لحاظ سے اسکا درجہ پست ہو گا۔ البتہ تفصیلی بحث میں داخل ہوئے بغیر قرآن مجید میں ایسے بکثرت سائنسی اشارے موجود ہیں جو انسان کو تحقیق اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں آیا ہے : وما من دابة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه الاامم امثالکم مافرطنا فی الکتاب من شی ء ثم الی ربهم یحشرون (اور زمین میں کوئی بھی رینگنے والا یا دونوں پروں سے پرواز کرنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر تمہاری طرح کی جماعت نہ رکھتا ہو۔ ہم نے کتاب میں کسی شے کے بیان میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ اسکے بعد سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ سورۂ انعام ۶ - آیت ۳۸) یہ آیت ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم حیوانات کی زندگی کی خصوصیات کا مطالعہ کریں' کیونکہ ان کا باہمی ربط و تعلق قائم کرنا' ان کی اجتماعی زندگی میں رائج تنظیم اور طرز عمل' خواہشات کی تسکین کا ان کا انداز اور دفاع کے ان کے مختلف طریقے' سب کے سب غور و فکر اور گہری تحقیق کے قابل ہیں اور انسان کے سامنے خالق اور مخلوق کی معرفت کے وسیع افق کھولتے ہیں۔

سوال : برائے مہربانی آیتِ قرآن : الرجال قوامون علی النساء (مرد عورتوں کے حاکم اور نگراں ہیں۔ سورۂ نساء ۴ - آیت ۳۴) کے بارے میں اپنا نکتۂ نظر بیان فرمائیے ؟

جواب : اس بارے میں ہمارا نکتۂ نظر علامہ (محمد حسین) طباطبائی کے نکتۂ نظر سے مختلف ہے۔ وہ (عورت پر مرد کی) قوامیت کو تمام شعبوں پر محیط قرار دیتے تھے' جبکہ ہم اسے صرف ازدواجی زندگی میں منحصر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ آیت آگے چل کر کہتی ہے :۔۔۔بما فضل اللہ بعضھم علی بعض و بما انفقوامن اموالھم (ان فضیلتوں کی بنا پر جو خدا نے بعض کو بعض پر دی ہیں اور اس بنا پر کہ انہوں نے عورتوں پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔ سورۂ نساء ۴- آیت ۳۴)اس طرح یہ پوری آیت عائلی زندگی کے بارے میں ہے۔ زوجیت کا تقاضا ہے کہ مرد عورت کے اخراجات برداشت کرے۔ کیونکہ مرد اپنی بیوی کا ذمے دار ہے' اسی طرح کہ جیسے باپ ہونے کے ناطے اپنے بچوں کا ذمے دار ہے۔ پس آیت کا پہلا اور بعد کا لب و لہجہ اولاً تو اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ عورت پر مرد کی قوامیت اس انفاق (خرچ) سے وابستہ ہے جو زوجہ ہونے کے ناطے مرد اس پر کرتا ہے۔ اور ثانیاً یہ امر مرد کی بعض ذاتی خصوصیات کا حاصل ہے جنہوں نے اسے عورت کی ضروریات پوری کرنے کا مکلّف قرار دیا ہے۔ کیونکہ عورت حمل اور بچے کو دودھ پلانے اور اسکی نگہداشت کی ذمے داری کی وجہ سے مرد کی مانند عملی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ اور یہی بات خاندان کے اخراجات کے سلسلے میں مرد کی قوامیت کے لئے عورت کے استحقاق کا باعث ہے۔ بہر حال یہ آیت قضاوت (Judge) اور سیاسی حاکمیت کے صرف مرد کے لئے مخصوص ہونے پر پوری نہیں اترتی۔

سوال : ہمارے پاس بہت سی احادیث ہیں' جو آیات قرآنی کی تاویل کرتی ہیں' کیا یہ احادیث آیات کے مصداق یا مصادیق کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ (بالفاظ دیگر) دراصل تاویل کے معنی کیا ہیں ؟ کیا متشابہ آیات کی تاویل کی جاسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ ان احادیث پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے ؟

جواب : تاویل سے مراد معنی کے لئے مرجع کا حصول ہے۔ یعنی مصداق کشف کرنا ہے۔

مثلاً قرآن کریم میں : یوم یاتی تاویله (سورۂ اعراف ۷ - آیت ۵۳) میں تاویله کے معنی روزِ قیامت کے واقعات ہیں۔ جو اس مفہوم کے قالب میں بیان کئے گئے ہیں۔ کبھی تاویل سے مراد لفظ کو اسی معنی پر حمل کرنا ہے جس پر آیت میں گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً آیت قرآن : وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم (اس کی تاویل کا علم صرف خدا کو ہے اور انہیں جو علم میں رسوخ رکھنے والے ہیں۔ سورۂ آل عمران ۳ - آیت ۷) سے مراد وہ غیبی امور ہیں جو قرآن نے بیان کئے ہیں۔ غیب سے مراد وہ امور ہیں جو چھوئے جاسکنے والے تجربے میں نہ آئیں۔

ہمیں حق نہیں کہ اس معنی پر دلالت کرنے والے الفاظ کو ظاہری معنی کے بر خلاف حمل کریں۔ اسی پیشِ نظر معانی پر الفاظ کو حمل کرنا تاویل ہے۔

تاویل کے ایک اور معنی جس کا ذکر ائمہؑ نے کیا ہے' وہ یہ ہیں کہ ہمیں آیات کے شانِ نزول کے مورد پر توقف نہیں کر لینا چاہئے بلکہ آیت کو تاریخ کے ہر دور میں اس شانِ نزول کے مشابہ تمام موارد پر عمومیت دینی چاہئے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے : قرآن کا نزول اسکا ظاہر اور تاویل اسکا باطن ہے اور وہ چاند اور سورج کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ گزرے ہوؤں کے بارے میں اس کی خبریں حاضرین کے بارے میں اسکی اطلاعات ہی کی طرح ہیں۔

اہل بیتؑ کی جانب سے تاویل کے ایک اور معنی یہ ذکر ہوئے ہیں کہ (تاویل یعنی) قرآن کے حقیقی معانی سے اسکے مجازی معنی تک پہنچنا' اور وہ بھی ان دونوں معانی کے درمیان موجود رابطے کے توسط سے۔

«کافی» میں آیا ہے کہ فضیل ابن یسار نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت قرآن : ومن احیاهافکا نما احیا الناس جمیعا (جس نے ایک نفس کو زندگی دے دی' اس نے گویا سارے انسانوں کو زندگی دے دی۔ سورۂ مائدہ ۵ - آیت ۳۲) کے بارے میں

سوال کیا' حضرتؑ نے فرمایا : کسی کو ڈوبنے یا آگ میں جلنے سے بچانا۔ انہوں نے کہا : کیا یہ آیت ایسے شخص کو بھی شامل کرتی ہے جو کسی کو گمراہی سے نجات دے اور حق کی طرف اسکی رہنمائی کرے ؟ حضرت نے فرمایا : ذلک تاویلها الاعظم ظاہراً تاویلِ اعظم سے مراد' آیت کا گہرا مفہوم ہے جو خدا سے رابطے اور اس کے راستے پر سفر کو حقیقی زندگی قرار دیتا ہے۔

البتہ روایات کے حوالے سے ہم ہمیشہ اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ جس طرح فقہ سے تعلق رکھنے والی روایات واحادیث کے متن اور سند پر گہری سوچ بچار کی جاتی ہے تفسیر سے متعلق روایات واحادیث میں اس سے بڑھ کر غور و فکر کرنا چاہئے' بالخصوص ایسی روایات میں جن میں اعتقادی پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا ہے' جو فروعی مسائل کی اساس اور بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔ بہت سی تفاسیر میں یہی دشواری پائی جاتی ہے کہ ان میں اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھے بغیر ان روایات کو درج کر دیا گیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ شیخ مفید فرماتے ہیں : عقل سزاوار نہیں کہ ان احادیث کی نفی کرے۔

حالانکہ ہماری بحث ان معانی کے عقلی امکان یا عدم امکان کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اشیاو امور کی طبیعت اور خاصیت کے ساتھ حدیث کے معانی کی ہم آہنگی پیش نظر ہونی چاہئے۔ علامہ طباطبائی پر ہمارا اعتراض یہی ہے کہ انہوں نے بعض ایسی احادیث کو بھی آیاتِ قرآن کی توجیہ کی اساس بنایا ہے جن کی صحت ثابت نہیں۔ جبکہ قرآنِ مجید اسلامی افکار کا بے عیب و بے نقص ماخذ ہے اور ہم اہل بیتؑ کے حکم : ماخالف کتاب اللہ فھوز خرف کی کسوٹی پر کھوٹی اور جھوٹی احادیث کو پرکھ سکتے ہیں۔

بایں ہمہ ایسی روایات جو اپنے الفاظ اور متن کے لحاظ سے محکم ہوں' وہ بے شک قرآنِ مجید کی تفسیر میں حجت کا درجہ رکھتی ہیں۔ جیسے آیۂ مباہلہ' سورۂ بنی اسرائیل میں شجر ملعونہ' اور آیۂ بلاغ وغیرہ سے مربوط احادیث۔

سوال : قران مجید کی تفسیر کرنے والے شخص میں کن شرائط اور قابلیتوں کا پایا جانا ضروری ہے ؟

جواب : قرآن کے مفسر کو عربی لغت سے آشنا ہونا چاہئے' یہاں تک کہ اسے عربی ادب کا تھوڑا بہت ذوق بھی ہونا چاہئے۔ کیونکہ قرآن کی عبارتیں بلاغت سے بھرپور ہیں اور اگر مفسر عربی ادب کا ذوق نہ رکھتا ہو تو قرآنِ مجید کی بلاغت سے استفادہ نہیں کر سکے گا۔ بہت سے مفسرین قرآنِ کریم کا لغوی فہم رکھتے ہیں جبکہ کسی لفظ کی تاریخ' اس لفظ میں واقع ہونے والی تبدیلیاں اور اس میں پائے جانے والے احساس اور جذبات سے واقفیت مفسر کے سامنے ایک نئی دنیا کھول دیتے ہیں۔

عربی زبان کی لغت سے آشنائی کے علاوہ مفسر کو قرآنی موضوعات سے بھی آشنا ہونا چاہئے۔ اسی طرح اسے معاشرے اور اس میں رائج قوانین سے بھی واقف ہونا چاہئے۔ کیونکہ قرآن مجید کی بہت سے آیات میں معاشروں اور طبیعت (Nature) میں رائج سنتوں اور قوانین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اور مفسر کیونکہ یہ چاہتا ہے کہ معاصر نسل کے لئے قرآن کی تفسیر کرے' اس لئے اسے اس دور' اس خطے اور اسکے تقاضوں سے بھی آگاہ ہونا چاہئے۔ تاکہ مناسب انداز میں قرآنی مفاہیم بیان کر سکے۔

اس سب کے ساتھ ساتھ مفسر کو احادیث پر بھی عبور ہونا چاہئے۔ یعنی وہ احادیث کی سند' متن اور ان کے مفہومی یا مصداقی تعلق کو مد نظر رکھتے ہوئے آیت کی تفسیر کرے۔ کیونکہ ائمہ معصومینؑ ہی راسخون فی العلم کے کامل مصداق ہیں۔

سوال : تغیر زمانہ کی بنیاد پر الفاظ کے مفہوم میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ کیا یہ تبدیلیاں تفسیر قرآن پر اثرانداز ہوتی ہیں ؟

جواب : الفاظ' استعمال کے تابع ہوتے ہیں اور ہر زبان کے اہلِ زبان حسبِ مناسبت بہت سے الفاظ کو ایسے مجازی معنی میں استعمال کرتے ہیں جو ان کے اوّلی معنی سے مختلف ہوتے

ہیں۔لہذا زبان کے ماہرین' لغوی اور عرفی معنی کے درمیان فرق رکھتے ہیں۔ لیکن قرآنی الفاظ کے حقیقی ادراک کے لئے زیر نظر لفظ کے عصر نزول میں معنی اور اس زمانے میں جاری تحولات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

سوال : آپ کیسی تفسیر کو پسند کرتے ہیں اور موجودہ تفاسیر میں آپ کیا نقائص محسوس کرتے ہیں ؟

جواب : میرے خیال میں ہمیں ایک ایسی تفسیر کی ضرورت ہے جو انسانوں کے سامنے قرآنِ کریم کا «کتاب زندگی» کی حیثیت سے تعارف کرائے اور انسان کو اسکی زندگی کے تمام شعبوں میں قرآن کا مخاطب سمجھے۔

بہت سی تفاسیر میں صرف روایات کے ذریعے تفسیر کی گئی ہے' جن کی سند اور متن کی توثیق نہیں ہوتی اور اگر ہم قدیم مقبول تفاسیر' جیسے البرھان' یا درالمنثور کا طرز اپنائیں تو ہمیں قرآن کی مانند یا اس سے قریب قریب معتبر احادیث پر اعتماد کرنا چاہئے۔

بعض تفاسیر ایک دوسرے سے خاصی ملتی جلتی تالیف کی گئی ہیں جیسے تفسیر تبیان اور تفسیر مجمع البیان جن میں شیعوں اور دوسروں کی آراء کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے جبکہ تفسیر المیزان میں علمی انداز اور فلسفی مشرب پر اعتماد کے ساتھ گہرے اور گراں قیمت مباحث پیش کئے گئے ہیں۔البتہ ہمیں اس تفسیر کے بہت سے مباحث سے بنیادی اختلافِ نظر ہے جس کی جانب ہم نے اپنی تفسیر من وحی القرآن کی جدید طباعت میں اشارہ کیا ہے۔

آقائے (ناصر) مکارم شیرازی کی «تفسیر نمونہ» عام افراد اور متوسط تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک اچھی تفسیر ہے۔البتہ تفاسیر میں پائی جانے والے بنیادی خامی یہ ہے کہ ان میں قران مجید کے کسی ایک پہلو پر گفتگو کی جاتی ہے اور دوسرے پہلوؤں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

سوال : قرآنِ مجید فرد کی تعمیر چاہتا ہے یا معاشرے کی تعمیر کا خواہاں ہے ؟ بالفاظ دیگر قرآنِ مجید کا اہم ترین اور بنیادی محور ایک بلند پایا انسان بنانا ہے یا ایک آئیڈیل معاشرے کا قیام ہے ؟

جواب : قرآنِ کریم ایک الٰہی پیغام کے طور پر انسانوں کے لئے نازل ہوا ہے تاکہ انسان کی (اسکی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں) اس انداز سے تعمیر کرے جیسی خداوندِ عالم کو مطلوب و مقصود ہے۔ اور انسان کی اجتماعی شخصیت کی تشکیل اور اسکی فکری اور انسانی تعمیر فقط خود اسکی ذات سے وابستہ نہیں اور انسان کی طبیعت و خاصیت یہ ہے کہ وہ انفرادی موجود نہیں کہ لوگوں سے معاشرتی ربط و تعلق کے بغیر زندگی گزار سکے۔ نیز معاشرتی زندگی کی تشکیل بھی معاشرے میں موجود افراد سے وابستگی و پیوستگی کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام کا مقصد 'انسان میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہے اور اسی نکتۂ نظر سے ہر انسان کی انفرادی شخصیت کی نشو و نما اور تعمیر اسکی اجتماعی اور معاشرتی شخصیت کی تشکیل کے لئے ایک وسیلہ اور راستہ ہے۔ کیونکہ اسلام ایسی تربیت کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا جو انسان کو معاشرے سے دور 'لوگوں سے علیحدہ' عزلت پسند اور گوشہ نشین بنادے 'بلکہ اس انداز سے انسان کی تربیت کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے سماج 'افراد معاشرہ اور دیگر انسانوں کے بالمقابل اپنی ذمے داری قبول کرے۔

اسی نکتۂ نظر کی بنیاد پر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض قرآنی آیات میں امت کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے : ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویا مرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (اور تم میں سے ایک گروہ کو ایسا ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے 'نیکیوں کا حکم دے 'برائیوں سے منع کرے۔ سورۂ آل عمران ۳ - آیت ۱۰۴) اس آیتِ شریفہ میں ایک ایسے معاشرے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جو فرد اور معاشرے کے قوی اور ضعیف نکات سے واقفیت کے لئے ان کی چھان پھٹک اور تحلیل کرتا ہے 'اب

چاہے یہ انفرادی میدان میں ہو یا اجتماعی میدان میں' یہاں تک کہ امت یا لوگوں کا یہ مجموعہ ایک بھرپور اور اعلیٰ تہذیب اور ثقافت کا حامل ہو جائے' تاکہ معاشرے میں نیکیوں اور امور خیر اور فلاح و بہبود کے فروغ کے لئے جد و جہد کرے اور سماج سے برائیوں' پستیوں اور گندگیوں کا صفایا کرے۔

ان ہی قواعد اور قوانین کا اطلاق منکرات پر بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند متعال قرآنِ مجید میں معاشرے اور امت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر (تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔ سورۂ آل عمران ۳- آیت ۱۱۰) اور یوں ایک ایسے معاشرے اور انسانوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو تمام لوگوں کو نیکی اور معروف کی سمت بلاتے اور منکرات اور برائیوں سے پرہیز کی دعوت دیتے ہیں۔ طبیعی بات ہے کہ قرآنِ مجید میں امت سے مراد' افراد کا ایک ایسا تشکیل شدہ مجموعہ ہے جو اس بنیاد پر ایک ہی مقصد کی راہ پر گامزن ہے۔

جب قرآن کریم مسلم مرد و زن اور مومن مرد اور مومن خواتین کے بارے میں بات کرتا ہے اور جس طرح خداوند عالم معاشرے کے ہر فرد کے لئے کتاب اور آئین کی بات کرتا ہے' اسی طرح معاشرے کے لئے بھی ایک دستور اور ایک کتاب کی بات کرتا ہے: وتری کل امة جاثیة کل امة تدعی الی کتابها (اور آپ ہر قوم کو گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا دیکھیں گے اور سب کو ان کے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا۔ سورۂ جاثیہ ۴۵- آیت ۲۸) اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے کے لئے بھی ایک آئین اور ایک کتاب ہے اور جس طرح ہر فرد کا حساب و کتاب ہو گا اسی طرح ہر امت کا بھی مواخذہ کیا جائے گا۔

اسی نظریے کی رو سے قرآن کریم اسلامی سماج اور امتِ اسلامی اور مسلمان مرد و زن سے خطاب کرتا ہے اور فرماتا ہے :ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص (بے شک اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اسکی راہ میں اس طرح صف باندھ کر جہاد کرتے ہیں جس طرح سیسہ پلائی ہوئی دیواریں۔ سورۂ صف ۶۱- آیت ۴)اور جب ہجرت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے' یا مہاجرین اور انصار کے بارے میں بات کرتا ہے تو بھی اجتماعی طور پر ایک امت سے محو گفتگو ہے اور اسی طرح اس وقت جب یہ فرماتا ہے کہ :محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحمدل ہیں۔ سورۂ فتح ۴۸-آیت ۲۹)

یوں ہم پر بخوبی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم کا انداز اور مقصد ایک ایسا مومن' پرہیز گار اور باشعور معاشرہ اور امت پیدا کرنا ہے جس کے افراد اپنی ذمے داریوں سے بھی آشنا ہوں اور دوسرے انسانوں اور حیاتِ اجتماعی کے بارے میں بھی ذمے دار اور اس سلسلے میں بھی اپنے فریضے سے باخبر ہوں۔

سوال : آپ کے خیال میں فکر و نظر کی آزادی کے بارے میں قرآن مجید کا نکتۂ نظر کیا ہے ؟ اور اس مفہوم پر کونسی آیات دلالت کرتی ہیں ؟

جواب : میں دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم کی عبارت اور اسکے انداز و اسلوب سے فکر و نظر کی آزادی کی تائید حاصل کی جاسکتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ موضوع دو انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

ا : مخالفین کی فکر' ان کے نظریے اور ان کی کہی ہوئی باتوں کو پیش کرنا اور قرآن کا ان افکار و آراء اور مباحث کا سامنا کرنے کا انداز۔

قرآن کریم میں گمراہ اور ٹیڑھی فکر کے لوگوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم کیوں

سوچتے ہو ؟(لماذا تفکرون.؟)۔ فکر کرنے اور سوچنے کے اصول پر اعتراض نہیں کیا گیا' بلکہ قرآن مجید ان سے یہ کہتا ہے کہ تمہاری سوچ غلط ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں پیغمبروں کے خلاف ان کے بعض دشمنوں کی تمام تہمتوں اور غلط خیالات کو نقل کیا گیا ہے مثلاً : وقالوا یا یھا الذی نزل علیه الذکر انک لمجنون (اور ان لوگوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل ہوا ہے' تو دیوانہ ہے۔ سورہ حجر ۱۵- آیت ۶)یا :ثم تولو اعنه و قالوا معلم مجنون (اور انہوں نے اس سے منھ پھیر لیا اور کہا کہ یہ سکھایا پڑھایا ہوا دیوانہ ہے۔ سورہ دخان ۴۴- آیت ۱۴)اور اسی طرح (آنحضرتؐ کو) کبھی شاعر کہا گیا' کبھی کذاب۔

حتیٰ قرآن مجید نے ان اتہامات کا ذکر بھی کیا ہے جو خود قرآن پر لگائے گئے ہیں' جیسے :ولقد نعلم انهم یقولون انما یعلمه بشر لسان الذی یلحدون الیه اعجمی و هذا لسان عربی مبین (اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ انہیں کوئی انسان اس قرآن کی تعلیم دے رہا ہے' حالانکہ جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں وہ عجمی ہے اور یہ زبان عربی واضح اور فصیح ہے۔ سورۂ نحل ۱۶- آیت ۱۰۳)اسی طرح یہ آیت : وقالواساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیه بکرة واصیلا (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف اگلے لوگوں کے افسانے ہیں جسے انہوں نے لکھوالیا ہے اور وہی صبح و شام ان کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵- آیت ۵)۔۔۔وغیرہ۔۔۔وغیرہ۔۔۔

قرآن مجید میں اس قسم کی آیات کی موجودگی' اس بات کی علامت ہے کہ قرآن کریم اپنے مخالفین کے افکار و اقوال پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ البتہ قرآن عقل و شعور کے حامل افراد سے چاہتا ہے کہ وہ ان افکار و اقوال کا دانائی پر مبنی اور خردمندانہ فکر کے ذریعے منطقی اور معقول جواب دیں اور ان افکار کی کمزوریوں کی نشاندہی کریں۔

ہمارے خیال میں، گو کہ اس قسم کی باتوں کا ذکر پڑھنے والے کے ذہن میں شبہ پیدا کرتا ہے، لیکن قرآنِ کریم کو کیونکہ اپنی حقانیت اور اپنے عقیدے کی حقیقت پر اعتماد ہے لہذا وہ اس قسم کی باتوں کے ذکر سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اس قسم کے شبہات سامنے لا کے انسان کو سوچ بچار اور تفکر و تعقل پر ابھارتا ہے۔

۲ : قرآن مجید میں آزادی کے بارے میں ایک آیت ہے جو انسان کو آزادی اور زندگی میں اپنی راہ و روش کے انتخاب کے سلسلے میں ذمے دار قرار دیتی ہے، تاکہ وہ زندگی کے لئے اپنے راستے اور اپنائی ہوئی فکر کے سلسلے میں خود جوابدہ ہو۔ اس مسئلے میں ہماری راہنمائی کرنے والے آیت یہ ہے : لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۵۶) اور وہ اس طرح کہ دین ایک سچی حقیقت کا حامل ہے اور اسکا راستہ استوار اور پائیدار ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو «لا اکراہ فی الدین» بے معنی سی بات ہو گی کیونکہ اکراہ کا مطلب ہے، کسی چیز کو اپنی پسند کے بر خلاف قبول کرنا۔

لیکن اگر کوئی فکر واضح اور آشکارا ہو اور انسان کو انتخاب اور چناؤ کا اختیار اور موقع دیا جائے اور مضبوط دلائل اور محکم گفتگو کی بنیاد پر ایک راستے کی سمت انسان کی رہنمائی کی جائے اور یہ نکتہ بھی اس پر کھول دیا جائے کہ غلط اور ٹیڑھی راہ کا انتخاب کرنے والا اسکے نتائج کا ذمے دار ہو گا اور اسے برے انجام کا سامنا کرنا پڑے گا، تو پھر اسکے بعد اکراہ کی گنجائش نہیں رہتی، جیسا کہ آیت قرآن : وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیو من و من شاء فلیکفر (اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے۔ سورۂ کہف ۱۸- آیت ۲۹) سے یہ مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنی اختیار کردہ راہ کا ذمے دار ہو گا۔ اور دوسری آیات، جیسے : افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (تو کیا آپ

لوگوں پر جبر کریں گے کہ سب مومن بن جائیں۔ سورۂ یونس ۱۰- آیت ۹۹) یا : وما جعلنا ک علیھم حفیظا وما انت علیھم بوکیل (اور ہم نے آپ کو ان کا نگہبان نہیں بنایا ہے اور نہ آپ ان کے ذمے دار ہیں۔ سورۂ انعام ۶- آیت ۱۰۷) کے معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر! آپ ان کی فکر اور رائے (تبدیل کرنے کے لئے ان) پر دباؤ نہیں ڈال سکتے' بلکہ آپ کو چاہئے کہ آپ اپنی فکر اور رائے لوگوں کے سامنے پیش کیجئے' اور ان کے جواب اور ان کے مثبت یا منفی رد عمل کی پروا کئے بغیر اپنا دستور اور پیغام ان کے سامنے رکھئے : فذکر ان نفعت الذکری (لہذا لوگوں کو سمجھاؤ' اگر سمجھانے کا فائدہ ہو۔ سورۂ اعلیٰ ۸۷- آیت ۹) یا : فذکر انما انت مذکر' لست علیھم بمصیطر (لہذا تم نصیحت کرتے رہو کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو' تم ان پر مسلط اور ان کے ذمے دار نہیں ہو۔ سورۂ غاشیہ ۸۸- آیت ۲۱' ۲۲) یا : وذکر فان الذکری تنفع المومنین (اور یاد دہانی بہر حال کراتے رہیں کہ یاد دہانی صاحبان ایمان کے حق میں مفید ہوتی ہے۔ سورۂ ذاریات ۵۱- آیت ۵۵) یہ تمام آیات اور ان ہی کی مانند دوسری آیات فکر ورائے کو اہمیت دینے اور فکر ورائے پر دباؤ قبول نہ کرنے کی عکاس ہیں کیونکہ یہ عمل کسی منطق اور کسی نظریے کے موافق نہیں۔

سوال : کیا قرآنِ کریم اجتماعی سیاست کے لئے کوئی خاص نکتۂ نظر رکھتا ہے' یا یہ کہ ایک وسیع النظر' آفاقی اور ہر زمانے' ہر معاشرے سے تعلق رکھنے والی تمام نسلوں کے لئے بنیادی اور تمدنی نکتۂ نظر کا حامل ہے ؟

جواب : یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ قرانِ کریم تفصیلی صورت میں کسی خاص سیاسی نکتۂ نظر کو مد نظر رکھتا تھا یا رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قرآن کریم عام اور آفاقی معیار اور پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ ہر دور کی ہر نسل اپنے زمانے کے حالات کے مطابق انہیں جانے' سمجھے اور انہیں سنت پیغمبرؐ سے جوڑ کر ان پر عمل کرے۔

سوال : قرآنِ مجید' تمدنی یاسیاسی مسائل کے بارے میں کیا نکتۂ نظر رکھتا ہے' اور اس کی نظر میں' ان میں سے کونسا مسئلہ زیادہ اہم ہے ؟

جواب : قرآنِ کریم انسانی آزادی کے مسئلے کو سیاسی زاویے سے سامنے لایا ہے' اسی طرح جیسے اس نے عدل کے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ قرآن کریم نے عدالت کو تمام انبیاء اور پیغمبروں کی رسالت کا محور قرار دیا ہے' جیسا کہ فرماتا ہے : لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ سورۂ حدید ۵۷- آیت ۲۵) لہذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تمام رسالتوں کا محور' تمام نبوتوں کی بنیاد اور ان سب کی تمام تر کوششیں اور جدوجہد عدل وانصاف کے قیام کے لئے تھیں۔

قرآنِ کریم کے امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں عدل کے مسئلے کو مختلف مراحل پر متنوع اور گوناگوں صورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح جیسے اس نے انسان کی آزادی کے مسئلے پر گفتگو کی ہے : وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر (اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے' اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے۔ سورۂ کہف ۱۸- آیت ۲۹) یا : افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے کہ سب مومن ہو جائیں۔ سورۂ یونس ۱۰- آیت ۹۹)۔

دوسری طرف' قرآنِ مجید تمدنی مسائل کے بارے میں تفکر اور تعقل کی بات کرتا ہے' اور غور و فکر ہی کو معرفت اور شناخت کا محور اور اسکی اساس قرار دیتا ہے' اسی طرح جیسے تجربے کو معرفت اور شناخت کی اساس اور سرمایہ قرار دیتا ہے : فاعتبروا یا اولی الابصار (تو صاحبانِ نظر عبرت حاصل کرو۔ سورۂ حشر ۵۹- آیت ۲)

تمدنی مسائل کے بارے میں قرآن کریم گفت و شنید کا راستہ تجویز کرتا ہے اور تعمیری و مثبت نتائج تک پہنچنے کے لئے گفتگو اور جدالِ احسن کو واحد راہ قرار دیتا ہے۔ لہذا بحث و مباحثے کے بارے میں بہترین راہ و روش یعنی افکار و نظریات کے تبادلے اور نقد و نظر کے خوبصورت اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے : وانا اوایاکم لعلی هدی اوفی ضلال مبین (اور کہئے کہ ہم یا تم (دونوں میں سے کوئی ایک فریق) ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں ہے۔ سورۂ سبا ۳۴- آیت ۲۴)

بحث اور گفتگو کو اس کی مقرر کردہ حدود سے خارج کر کے یہ نہیں کہا گیا کہ میری رائے حقیقت اور عین درست ہے اور اس میں خطا اور غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ فرماتا ہے کہ ہم ایک فکر اور رائے کے ساتھ اور وہ بھی ایک دوسری فکر اور رائے کے ہمراہ ایک دوسرے کے بالمقابل 'ایک ہی سطح پر آ کے بیٹھتے ہیں اور دونوں ہی اپنی فکر اور رائے سے دستبردار ہو کے اس کے بارے میں شک کو ذہن میں جگہ دیتے ہیں تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ ہم میں سے کس کا تجویز کردہ راستہ حق اور حقیقت پر مبنی ہے اور ہم دونوں میں سے کون باطل پر ہے۔

اس طرح قرآن کریم نے عقلی اور تجربی مسائل میں معرفت کے حصول اور حق تک رسائی کے لئے بہترین راہ کی نشاندہی کی ہے اور بحث و گفتگو کو حق و حقیقت تک پہنچنے کے لئے بنیاد اور اساس قرار دیا ہے۔

سوال : مکی اور مدنی آیات اور سوروں کے بارے میں جنابِ عالی کا نکتۂ نظر کیا ہے ؟ کیا مراد یہ ہے کہ ہر وہ آیت اور سورہ جو مدینہ میں نازل ہوا ہے وہ مدنی ہے اور ہر وہ آیت اور سورہ جو مکہ میں نازل ہوا ہے وہ مکی ہے 'یا آپ اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں ؟

جواب : بے شک سوروں یا آیات کو اصطلاحاً مکی یا مدنی کہنے کی بنیاد 'ان کا مکہ یا مدینہ میں نازل ہونا' ہونی چاہئے۔ لیکن وہ چیز جو مکی سوروں کے مضمون و مشمولات کو مدنی سوروں سے

علیحدہ اور جدا کرنے کا باعث ہوئی ہے' وہ یہ ہے کہ مکہ کی فضا پر دعوت و تبلیغ کا غلبہ تھا' وہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے اور ان تک اسلام کی دعوت پہنچانے کا مرحلہ تھا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ مکی سورے ان موضوعات کے بارے میں رہنمائی کرتے ہیں جن کا تعلق عقیدے کی بنیادوں اور خدا سے ربط و تعلق کے دروازے کھولنے سے ہے۔ جبکہ مدنی سورے زیادہ تر ان موضوعات کے بارے میں رہنمائی کرتے ہیں جو معاشرے' افرادِ معاشرہ' اور اجتماعی قوانین سے تعلق رکھتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا اسلوب عصر حاضر کے اکیڈمک اور منظم اسلوب سے مختلف ہے۔ اس میں عقیدتی پہلو' قانونی پہلو سے انتہائی نزدیکی تعلق رکھتا ہے' اسی طرح جیسے کہ پند و نصیحت کا قرآنی پہلو بھی اسکے عقیدتی پہلو سے ربط رکھتا ہے۔ اس نکتۂ نظر کی بنا پر قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مکی سوروں میں صرف اور صرف اعتقادی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور مدنی سوروں میں فقط قانون سازی کے پہلوؤں پر بات ہوئی ہے۔

کیونکہ قرآنِ مجید انسان سازی کے لئے نازل ہوا ہے' تاکہ انسان کو بنیادی اعتقادات میں' مفاہیم میں' زندگی کے لئے اختیار کی جانے والی راہ و روش میں' معاشرتی امور میں' الغرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں رہنمائی فراہم کر سکے۔ لہذا قدرتی بات ہے کہ ہم قرآن کریم کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے سے جدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً قرآن مجید جس وقت اعتقادی مسائل کے بارے میں بات کرتا ہے' اسی وقت روز جزا' بہشت اور جہنم کے بارے میں بھی بات کرتا ہے' یا جب قانون اور شریعت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے' تو اسی وقت اچھے کاموں کی جزا و ثواب اور برے کاموں کی سزا و عذاب کا ذکر بھی کرتا ہے' اور اسی طرح دوسرے مسائل کے بارے میں ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ مکی سوروں میں زیادہ تر اعتقادی پہلو اور خوف و امید کی جہات کا ذکر کیا گیا ہے اور مدنی سوروں میں زیادہ تر اجتماعی پہلو' شریعت' قانون سازی' اقدار و فضائل کی وضاحت

اور جنگ وغیرہ کے موضوعات بیان ہوئے ہیں۔

سوال : جیسا کہ آپ کے علم میں ہوگا کہ شیعوں پر تحریف قرآن کی تہمت لگائی جاتی ہے' اس بارے میں جناب عالی کی رائے کیا ہے ؟

جواب : میرے خیال میں تحریفِ قرآن کے مسئلے پر جو احادیث شیعہ اور سنی کتابوں میں موجود ہیں' ان کی بنیاد پر شیعوں اور بر ادران اہل سنت کے درمیان اس مسئلے پر بہت زیادہ بحث و گفتگو ہوئی ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں نہ ہی اہل سنت اور نہ ہی اہل تشیع یہ سوچ رکھتے ہیں کہ کچھ ایسی آیات جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن مجید سے حذف کر دی گئی ہیں (اور جن کے بارے میں دونوں ہی کی کتابوں میں احادیث موجود ہیں) انہیں قرآن میں شامل کیا جائے' یا نہ ہی (ان دونوں میں سے کسی فریق نے) اس سلسلے میں کوشش کی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ان شیعہ علمانے بھی نہیں جو تحریف قرآن کے قائل ہوئے اور جنہوں نے آیت قران :انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سورۂ حجر ۱۵- آیت ۹) کی تاویل کی کوشش کی ہے۔

شیعہ تاریخ میں' اب تک کسی ایک شخص نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ قرآن مجید' جو آج لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' اس میں کسی ایک لفظ کا بھی اضافہ ہوا ہے' اسی طرح اہل سنت میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس نے : الشیخ والشیخة فار جموھم کو قرآن میں جگہ دی ہو۔ یا یہ کہا ہو کہ فلاں یا فلاں صحابی سے جو کچھ نقل کیا گیا ہے اسے قبول کیا جائے۔ بلکہ شیعہ تو متفقہ طور پر اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ (نزول قرآن کے آغاز سے لے کر اب تک) قرآن کریم میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا ہے۔

دوسری طرف یہ حقیقت بھی سب ہی کے علم میں ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ (جن کی

جانب تحریف قرآن سے متعلق بعض احادیث کو نسبت دی گئی ہے) عام لوگوں کے ہاتھوں میں موجود قرآن ہی کو اپنے برہان و استدلال کی بنیاد قرار دیتے ہیں' اور پیغمبر اسلامؐ سے منقول یا خود اپنی فرمائی ہوئی تمام احادیث کی تصحیح و تفسیر کے لئے اسی سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہی موجودہ قرآن قطعی' حتمی اور دائمی سند کے عنوان کا حامل ہے' جس کے بارے میں آیا ہے کہ :لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه (جس کے قریب' سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل نہیں آسکتا۔ سورۂ فصلت ۴۱- آیت ۴۲) اور اسی بنا پر موجودہ قرآن مجید تمام اسلامی مفاہیم اور تمام احادیث و روایات کی تصحیح و تفسیر کی بنیاد رہے گا۔

لہذا ہم تمام (شیعہ اور سنی) مسلمانوں سے تہہ دل سے درخواست کرتے ہیں کہ اس لاحاصل بحث اور جدال کو ختم کریں۔ کیونکہ ہمیں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلے ہوئے شیعہ شہروں اور اسی طرح اسلامی ممالک کے دوسرے علاقوں میں کسی ایک بھی ایسے قرآن کا علم نہیں جو دوسرے قرآنوں سے مختلف ہو' حتی (پوری دنیا میں پائے جانے والے قرآنوں میں) ایک نقطے' ایک فاصلے تک میں معمولی سا فرق بھی نہیں ملتا۔ یہ بحث اور جدال ہرگز صحیح اور معقول نہیں اور اسکا نتیجہ بدگمانی' عناد اور باہمی دشمنی کے سوا کچھ اور نہیں نکلے گا۔

سوال : جمع قرآن کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ؟

جواب : ہمارے اعتقاد کے مطابق' قرآنِ کریم خود پیغمبر اسلامؐ کے زمانے ہی میں ترتیب دے دیا گیا تھا۔ مثلاً جب کوئی آیت نازل ہوتی تو خود آنحضرتؐ فرماتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورے میں رکھو' یا اسکی جگہ فلاں آیت یا فلاں سورے کے ساتھ ہے۔ ہماری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ خود پیغمبرؐ سے نقل ہونے والی بعض روایات میں اور خود آنحضرتؐ

جن سوروں کی تلاوت فرماتے تھے' ان میں آیات کی جگہ اور مقام معین اور مشخص کیا گیا ہے۔

لیکن (دورِ پیغمبرؐ میں) قرآنِ مجید ایک یکجا مجموعے یا ایک نسخے کی صورت میں جمع نہیں ہوا تھا' بلکہ یا تو متفرق تحریروں کی شکل میں مختلف افراد کے پاس موجود تھا' یا حافظان قرآن کے سینوں میں محفوظ تھا۔ یہاں تک کہ جنگِ یمامہ پیش آئی جس میں ستر حافظِ قرآن شہید ہو گئے اور یوں قرآن کی جمع آوری کی ضرورت دو چند ہو گئی۔ پہلے اور دوسرے خلیفہ کے دور میں اس ضرورت کا احساس ہوا' لیکن آخری جمع آوری اور تدوین خلیفۂ ثالث کے دور میں ہوئی۔ لہذا قرآنِ مجید ایک مجموعے اور نسخے کی صورت میں اور قریش کے لہجے میں جمع ہوا۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے (اس میں نہ کمی ہوئی ہے نہ اضافہ)۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو جمع قرآن کا کام امیر المومنینؑ کی حیات مبارک میں ہوا' اگرچہ خود آپؑ نے اسے جمع نہیں کیا ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اگر آپؑ اس میں کوئی معمولی سا نقص بھی دیکھتے' یا اس میں کوئی معمولی سا اضافہ بھی کیا جاتا تو حضرتؑ متنبہ کرتے اور اسکی روک تھام کرتے۔ وہ امامؑ جو نزول قرآن کے آغاز سے لے کر اسکے اختتام تک ہمیشہ اسکے ہمراہ اور ہمدم تھے۔ یہاں تک کہ بجا طور پر پیغمبرؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے علی! جو کچھ میں سنتا ہوں' آپ بھی وہ سنتے ہیں اور جو کچھ میں دیکھتا ہوں آپ بھی وہ دیکھتے ہیں' فرق اتنا ہے کہ آپ نبی نہیں ہیں۔ (نہج البلاغہ - خطبہ ۱۹۰)

یقیناً' حضرت علی (جو پیغمبرؐ کی طرف سے اسلام اور قرآن کے حقیقی امانتدار تھے) خلیفۂ ثالث کے جمع کیے ہوئے قران' یا لوگوں کے پیش کیے گئے نسخوں میں (اصل

قرآن سے) معمولی سا فرق یا کمی بیشی بھی دیکھتے تو آپؑ کی ذمے داری اور فریضہ تھا کہ آپؑ اسکی طرف سے ہوشیار اور خبردار کرتے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ ہی حضرت علیؑ نے اس بارے میں کچھ فرمایا اور نہ ہی دوسرے ائمہ معصومینؑ نے اس بارے میں کچھ کہا یا (اس قرآن پر) اعتراض کیا ہے۔

سوال : آخر میں ہماری استدعا ہے کہ تفسیر کے بارے میں کوئی منفرد اور نئی بات آپ کے پیش نظر ہو تو ہمارے قارئین کے لئے فرمایئے ؟

جواب : میں کوشش کرتا ہوں کہ زندگی کے حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے' معاشرے کی ہدایت ورہنمائی کے لئے ہمیشہ قرآنِ کریم سے روشنی حاصل کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنِ کریم گھر گھر 'گلی گلی' کوچے کوچے 'پورے معاشرے میں جاری وساری نظر آئے اور میری جدوجہد اسی مقصد کے لئے ہے کہ لوگوں کو یہ احساس عطا کیا جائے کہ اگر وہ ایک حقیقی زندگی کے متلاشی ہیں تو اسے قرآن میں اور اسکی ہمراہی میں تلاش کریں اور اسی بنا پر میں نے قرآنی مفاہیم کی تنقیح اور ان کا استخراج کیا ہے' جسے میری تفسیر ((من وحی القرآن)) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ادراہ : ہم جنابِ عالی کے شکر گزار ہیں اور درگارہ الٰہی میں آپ کی سرخروئی اور قرآنی معارف میں بیش از بیش اضافے کے لئے دعا گو ہیں۔

استاد : ہم بھی آپ کے مشکور ہیں' خدا آپ کا حامی وناصر ہو۔

☆☆☆

دین، معاشرہ اور حکومت

یہ انٹرویو ایران کی «مجلسِ خبرگان» کے دفتر سے شائع ہونے والے مجلّے «حکومتِ اسلامی» کے شمارہ نمبر ۱۶ سے لیا گیا۔

دین، معاشرہ اور حکومت

سوال : جنابِ عالی کے شکریئے کے ساتھ ، ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ اجتماعی اور معاشرتی امور میں دین کس قدر اور کن حدود تک دخل رکھتا ہے ؟ کیا ان امور میں دین تفصیل کے ساتھ دخالت رکھتا ہے یا صرف عام اقدار (Values) کے بیان پر اکتفا کرتا ہے ؟

جواب : بسم اللہ الرحمن الرحیم ' انسان کے اجتماعی امور کے بارے میں دین نے جو بنیاد فراہم کی ہے اسکے مطالعے اور جائزے کے دوران ہمیں پتا چلتا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے تمام انبیاء کے سامنے اور اپنی نازل کی ہوئی تمام کتابوں میں ، عدل وانصاف کی جانب انسانوں کے سفر کو ہدف قرار دیا ہے۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ سورۂ حدید ۵۷ - آیت ۲۵)

عدل کی اصطلاح انسان کے تمام روابط و تعلقات (جس میں انسان اور خدا اور انسانوں کے باہمی روابط و تعلقات بھی شامل ہیں) کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ عدل کا مفہوم یہ ہے کہ ہر حق اسکے حقدار کو دیا جائے۔ خداوند عالم کا ایک حق ہے ، انسان ایک حق رکھتے ہیں اور وہ طبیعت Nature اور کائنات جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں وہ بھی ایک حق

رکھتی ہے، جو ہمیں اس کی حفاظت کا پابند کرتا ہے۔ اس بنیاد پر عدل کا مجموعی مفہوم انسانی حیات کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب اور سنتِ پیغمبرؐ وائمۂ معصومینؑ میں (جن کی سنت در حقیقت سنتِ پیغمبرؐ ہی کا تسلسل ہے) عدل کے بعض مصادیق کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً کتاب و سنت میں میاں بیوی کے اور تمام انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق کا جو ذکر ملتا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ شریعت بہت سی جزیات تک میں دخل رکھتی ہے۔ ایسی احادیث بھی ہیں جو کہتی ہیں کہ خداوندِ عالم نے انسانوں کے لئے ضروری تمام چیزوں کو بیان کیا ہے یہاں تک کہ جلد پر آجانے والی خراش تک کا جرمانہ ذکر ہوا ہے۔

خداوندِ عالم نے اپنی شریعت لوگوں پر نازل کی ہی اس لئے ہے کہ وہ میدانِ حیات میں انسانوں کی سرگرمیوں کا تعین کرے۔ البتہ اس کے معنی یہ نہیں کہ خداوندِ عالم نے قانون سازی کے میدان میں انسانوں کے لئے آزادیٔ عمل باقی نہیں رکھی ہے۔ بلکہ ہم بہت سے ایسے کلی عناوین پاتے ہیں جن کی جزئیات کی تشخیص انسانوں یا انسانی عقل پر چھوڑی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دین نے بہت سے احکام کو عنوانِ ثانوی کے لحاظ سے (کہ جنہیں انسان دریافت کر سکتے ہیں اور جنہیں عقل درک کرتی ہے اور جو قابلِ عمل ہیں) انسانوں کی عقل پر چھوڑا ہے۔ مثلاً راست گوئی واجب اور جھوٹ حرام ہے۔ لیکن اگر کسی مسئلے میں جھوٹ بولنا مصلحت کا تقاضا ہو جائے اور صورتحال یہ ہو کہ راست گوئی کی وجہ سے فساد پھوٹ پڑنے کا خوف ہو اور کذب بیانی مصلحت دکھائی دے تو واضح ہے کہ انسان کو جھوٹ کا راستہ اپنانا چاہئے۔

اسی طرح عقل بھی فیصلہ دیتی ہے اور شریعت بھی اس فیصلے کی تائید کرتی ہے کہ اگر راست گوئی کسی بے گناہ انسان کے لئے ضرر رساں اور کسی مظلوم کے جان سے جانے پر منتہی ہو تو حرام ہے۔ کیونکہ عقل انسان کی باطنی رسول اور انسان پر خدا کی حجّت ہے۔

اور دوسرے موارد بھی مل سکتے ہیں جن میں عقل کا فیصلہ (موقف کا) تعین کرتا ہے۔ ہمارے پاس علمِ اصول میں «تزاحم» کے نام سے ایک قاعدہ موجود ہے، جو کہتا ہے کہ اگر معاملہ یہ آپڑے کہ ایک طرف اہم ہو جس میں مصلحت ہے اور دوسری طرف اہم ترین ہو جس میں مفسدہ ہے تو ہمیں اہم کا چناؤ کرنا چاہئے۔ لہذا اجتماعی امور میں دین اس انداز سے دخالت نہیں کرتا جو انسان کے جمود پر منتہی ہو اور اس کی عقل و شعور کو نظر انداز کر دے۔ جیسے کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ بہت سے دینی احکام پر ممکن ہے عنوانِ ثانوی لاگو ہو، جس کا فہم انسانوں کی عقل پر چھوڑا گیا ہے۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین دراصل انسان اور خداوند عالم کے درمیان تعلق کا نام ہے اور اسکا انسانوں کی اجتماعی حیات اور امورِ معیشت سے کوئی سروکار نہیں؟

جواب: ان لوگوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کا فہم دین مغرب میں دین کی صورتحال کے بارے میں ہونے والی تحقیقات سے ماخوذ ہے۔ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین کو تنگ یا پھر وسیع اور کھلے دائرے میں قرار دیا جانا چاہئے تو ہمیں اس دین کے مصادر اور منابع (Sources) کا جائزہ لینا چاہئے۔

جب ہم دینِ اسلام کے بنیادی مصادر و منابع (جو کتاب و سنت ہیں) کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اس دین میں انسان پر خدا کے حقوق، انسان پر انسان کے حقوق، حاکم پر رعایا کے حقوق، رعایا پر حاکم کے حقوق، حتی ماحول پر انسان کے حق کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح انسان کے باہمی روابط (خواہ وہ اجتماعی اور عام روابط ہوں، خواہ انفرادی اور خاص روابط) کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شرعی اور قانونی احکام، حتیٰ انسانی زندگی کے مسائل کی جزئیات تک کی تکلیف کو واضح کیا گیا ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ (احکام میں نظر آنے والی تفصیل) فقہا کے اجتہاد کی بنا پر ہے، اور بشر کا اجتہاد وحیٔ منزل نہیں۔

ان لوگوں کے جواب میں ہم کہیں گے کہ مجتہدین کے اجتہاد کی بنیاد ان کے انفرادی رجحانات اور مزاج نہیں' یہ احکام مجتہدین کے بنائے ہوئے احکام نہیں ہیں' بلکہ انہوں نے انہیں کتاب و سنت سے اخذ کیا ہے۔ خود ہمارا بھی یہ عقیدہ نہیں کہ مجتہدین اپنے اجتہاد میں معصوم ہیں۔ ہم مجتہدین سے ان تمام امور میں اختلاف کر سکتے ہیں جن میں انہوں نے اجتہاد کیا ہے۔ اور اگر ہم یہ دیکھیں کہ کسی مقام پر وہ خطا کے مرتکب ہوئے ہیں تو ہم اسکی تصحیح کر سکتے ہیں اور ان سے مختلف فقہی حکم کا استخراج کر سکتے ہیں۔ حتیٰ ہمارا عقیدہ تو یہ بھی ہے کہ اگر کسی حکم میں علما کے درمیان اجماع نظر آئے اور یہ امکان دکھائی دے کہ اس اجماع کی بنیاد ایک خاص فکری حالت، یا علمِ اصول میں اجماع کے بارے میں کسی مخصوص طرز فکر میں پائی جاتی ہے اور یہ جان لیں کہ اس مسئلے میں واقع ہونے والا اجماع غلط ہے تو ہمیں چاہئے کہ اس اجماعی حکم سے دستبردار ہو جائیں۔

لیکن وہ لوگ جن کا خیال یہ ہے کہ دین خود کو صرف عبادات میں منحصر کرتا ہے اور اس نے محض انسان اور خدا کے تعلق کے دائرے میں اپنا تعارف کرایا ہے' ہم ان لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے دینِ اسلام کا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے اور حتیٰ حضرت موسیٰ کے دین اور کتابِ تورات کے بارے میں بھی صحیح معلومات نہیں رکھتے۔ تورات ایک ایسی کتاب کے طور پر نازل ہوئی ہے جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ تورات میں انسانوں کی اجتماعی زندگی کے احکام و قوانین کا ذکر ہوا ہے۔ ہاں! عہدِ جدید (کتابِ انجیل) میں انسانوں کے باہمی تعلقات کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان نہیں ہوئے ہیں۔ کیونکہ اس زمانے کے مسیحی حضرات اس قسم کے مسائل میں تورات کی تعلیمات پر عمل کرتے تھے۔

ہم ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ آیئے دینِ اسلام کے منابع و مصادر (Sources) کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ آپ کا دعویٰ دینِ اسلام

پر منطبق (Fit) ہوتا ہے یا نہیں ؟

اپنے مطالعات کی بنیاد پر ہمارا عقیدہ ہے کہ دینِ اسلام نے انسان کے خدا سے اور لوگوں اور خود اپنے آپ سے ربط و تعلق کو بیان کیا ہے۔

سوال : دین کا علومِ انسانی سے کس نوعیت کا رابطہ ہے ؟ کیا دین نے ان امور کو اپنے اندر سمیٹا ہوا ہے' یا اس نے ان علوم کی تصحیح کی ہے' یا یہ کہ علومِ انسانی اور دین کا دائرہ ایک دوسرے سے جدا ہے ؟

جواب : دین علوم کی بنیاد رکھنے اور ان کو وجود میں لانے کے لئے نہیں آیا ہے۔ دین جو انبیاء (بالخصوص پیغمبر اسلامؐ) پر ایک پیغام کے عنوان سے نازل ہوا ہے' اسکا کام فزکس، کیمسٹری اور طبیعی علوم جیسے علمی شعبوں کو ایجاد کرنا نہیں تھا اور نہیں ہے۔

دین نے کچھ طریقے وضع کئے ہیں' اور کچھ مفاہیم پیش کئے ہیں اور کچھ خطوط (Lines) کھینچے ہیں۔ اسلام نے معرفت کے موضوع پر انسان کے لئے جو طریقہ وضع کیا ہے وہ دو دائروں کا حامل ہے۔ پہلا دائرہ ، غور و خوض، فکر و تامل کا دائرہ ہے : ویتفکرون فی خلق السماوات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلا۔ (اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں (کہ) خدایا تو نے یہ سب بے کار نہیں پیدا کیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران ۳ - آیت ۱۹۱) اور دوسرا دائرہ ، تجربے اور استقراء کا دائرہ ہے : فاعتبرو یا اولی الابصار۔ (پس اے صاحبانِ نظر عبرت حاصل کرو۔ سورۂ حشر ۵۹ - آیت ۲)

دین' انسان سے کہتا ہے کہ خداوندِ عالم نے تجھے عقل سے نوازا ہے۔ پس غفلت چھوڑ دے تاکہ حتیٰ الامکان اسرارِ حیات اور کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھا سکے۔ اور خداوندِ عالم نے تجھے حواس عطا کئے ہیں تاکہ ان کے ذریعے اشیاء کو براہِ راست پہچان سکے۔ پس ذمے داری کے ساتھ ان حواس سے استفادہ کر : الم نجعل له عینین و

لسانا و شفتین و ھدینہ النجدین۔ (کیا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دی ہیں' اور زبان اور دو ہونٹ بھی اور ہم نے اسے (خیر و شر) دونوں راستوں کی ہدایت دی ہے۔ سورۂ بلد ۹۰- آیات ۸ تا ۱۰)

اے انسان! ان حواس کو فضول اور بے کار اپنے حال پر نہ چھوڑ اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جا جن کے دل تاریک ہیں اور جو بہرے اور اندھے ہیں۔

لہذا ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اسلام نے حصولِ معرفت کے سلسلے میں انسان کے لئے ایک قاعدہ اور طریقہ وضع کیا ہے اور انسان سے چاہا ہے کہ اپنی فکری کوششوں کے نتائج دو ماخذ اور مادّوں یعنی غور و فکر اور تجربے سے حاصل کرے۔ اور دوسروں سے گفتگو کے دوران بھی ان دو عناصر سے استفادہ کرے۔ اسی بنا پر خداوندِ عالم جدالِ احسن کی بات کرتا ہے اور انسان سے تقاضا کرتا ہے کہ کسی فکر سے بحث و مباحثہ کرتے ہوئے اسکا اچھی طرح سے جائزہ لے : ھا انتم ھولاء حا ججتم فیما لکم بہ علم فلم تحاجون فیما لیس لکم بہ علم۔ ((اے اہلِ کتاب) اب تک تم نے ان باتوں (کے بارے) میں بحث کی ہے جن کا (تمہیں) کچھ علم تھا' اب اس بات میں کیوں بحث کرتے ہو جس کا (تمہیں) کچھ بھی علم نہیں ہے۔ سورۂ آلِ عمران ۳- آیت ۶۶)

اور یوں خداوندِ عالم انسان سے چاہتا ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو مسترد کرنے یا اسکی تائید کے لئے دلیل قائم کرے : قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ (کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل لے آؤ۔ سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۱۱)

لہذا دین نے معرفت کے حصول کا ایک واضح اور روشن قاعدہ پیش کیا ہے۔ اب کبھی تو انسان معرفتِ فلسفی کی سرحد پر پہنچ جاتا ہے' اس قسم کی معرفت کوئی اسلامی معرفت شمار نہیں ہوتی۔ یعنی یہ معرفت خطا اور غلطی سے پاک اور ایسی معرفت نہیں جس سے اختلاف نہ کیا جا سکے۔ کیونکہ استدلال کا یہ طریقہ 'بشری طریقہ ہے اور اس پر بحث

اور اس سے اختلاف کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلامی فلسفہ ایک چیز ہے اور اسلام ایک دوسری چیز' اسلامی فلسفے کو اسلام پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی فلسفہ ایک ایسا علم ہے جس میں فلسفیوں کے فکری تجربات کے ذریعے (جو کبھی درست اور کبھی غلط بھی ہو سکتے ہیں) بعض اسلامی افکار و عقائد پر استدلال کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلامی فلسفہ مسلمانوں کا فلسفہ ہے' اسلام کا فلسفہ نہیں۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلامی فلسفے نے یونانی فلسفے کی کوکھ سے جنم لیا ہے' اور یونانی فلسفے سے آشنا مسلمان مفکرین نے اس میں مختلف چیزوں کا اضافہ کیا ہے اور اسکے کچھ حصے کی تصحیح کی ہے۔

البتہ قرآنِ مجید میں بعض فلسفی افکار کا ذکر آیا ہے۔ ہر چند یہ افکار فلسفی ہیں' لیکن ایک دوسرے پہلو سے وجدانی ہیں' جیسے یہ آیت : ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معه من اله اذ ا لذهب کل اله بما خلق ولعلا بعضهم علی بعض۔ (یقیناً خدا نے کسی کو (اپنا) بیٹا نہیں بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہے' ورنہ ہر خدا اپنی مخلوقات کو لے کر الگ ہو جاتا اور ہر ایک دوسرے پر برتری کی فکر کرتا۔ سورۂ مومنون ۲۳- آیت ۹۱)' یا یہ آیت :لو کان فیهما الهة الا اللہ لفسد تا۔ (یادرکھو اگر (زمین و آسمان میں) اللہ کے علاوہ اور معبود بھی ہوتے تو یقیناً (زمین و آسمان دونوں) برباد ہو جاتے۔ سورۂ انبیاء ۲۱- آیت ۲۲)' اسی طرح آیت :وضرب لنا مثلا ونسی خلقه قال من یحیی العظام وهی رمیم، قل یحییها الذی انشاها اول مرّة و هو بکل خلق علیم۔ (اور ہمارے لئے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا ہے' کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر (قسم کی) مخلوق کا جاننے والا ہے۔ سورۂ یٰسین ۳۶- آیت ۷۸' ۷۹)

مذکورہ آیات کے مضمون کو مروجہ معنوں میں فلسفہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہر چند فلسفیوں نے کوشش کی ہے کہ ان کے لئے ایک فلسفی قالب تراش لیں (بلکہ) یہ مطالب وہ امور ہیں جو انسان کے وجدان سے تعلق رکھتے ہیں البتہ ممکن ہے یہ کسی فلسفی قاعدے میں جگہ دیئے جانے کے قابل ہوں۔

دراصل ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ تمام علوم (چاہے ان کا تعلق فلسفے سے ہو' نفسیات سے یا علومِ اجتماعی اور علومِ انسانی کی دوسری شاخیں ہوں) انسانی و بشری آراء و نظریات کا ایک ایسا مجموعہ ہیں جن کے بعض مسائل میں بعض مفکرین نے کسی قرآنی آیت یا پیغمبرؐ کی کسی حدیث کو بطورِ سند پیش کیا ہے لیکن اس آیت یا اس حدیث سے ان کا کوئی معنی سمجھنا' انسانی اجتہاد کی بنیاد پر حاصل ہونے والا فہم ہے' جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

ہاں! ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ایک آیت سے پیغمبر جو کچھ سمجھتے ہیں' وہ بغیر کسی غلطی کے ایک صحیح (Perfect) فہم ہوتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر کو کتاب اور حکمت کی تبلیغ کے لئے (خدا کی جانب سے) لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ لہذا پیغمبرؐ کا فہم انسانی اور بشری فہم نہیں بلکہ خطا اور اشتباہ سے محفوظ فہم ہے۔ اسی طرح کیونکہ اہل بیتؑ معصوم ہیں' اس لئے ان کا فہم بھی غلطی اور خطا سے پاک معصوم فہم ہے۔ البتہ قدرتی بات ہے کہ جس حدیث کی ان کی طرف نسبت دی جاتی ہے' وہ حدیث ان ہی کی ہے یا نہیں' اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اور احادیث کی صحت یا سقم کا تعین کرنے والے بنیادی راستوں میں سے ایک راستہ' احادیث کو قرآنِ مجید سے تطبیق دینا ہے۔ جیسا کہ خود ائمہؑ سے منقول ہے کہ (ہم سے منسوب) احادیث میں جو حدیث کتابِ خدا کے مخالف ہو وہ جعلی حدیث ہے جسے ہم سے نسبت دی گئی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ دین کچھ علوم کی بنیاد رکھنے کی غرض سے نہیں آیا کہ جس کی بنا پر وہ علوم' دینی علوم کہلائیں۔ علوم کی بنیاد انسانوں نے رکھی ہے' اسی کے درمیان مسلمانوں

نے بھی اجتہاد کے لئے اور کتابِ خدا اور سنتِ پیغمبرؐ کو سمجھنے کی کوشش کے دوران کچھ علوم وضع کئے ہیں۔ اور حقیقت تک پہنچنے کے سلسلے میں مسلمانوں کا اجتہاد کبھی ممکن ہے کامیاب رہا ہو اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ حقیقت تک پہنچنے میں ناکام رہا ہو' لہذا ان علوم کو اس لحاظ سے کہ ان سے اسلامیت کا اظہار ہوتا ہے' علومِ اسلامی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس لحاظ سے کہ یہ علوم (اسلامی اجتہاد کی بنیاد پر) اسلامی مسائل' مفاہیم اور مظاہر کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں' انہیں علومِ اسلامی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ایک اور بات جسے اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے وہ (بعض لوگوں کا) یہ دعویٰ ہے کہ دین علم کا مخالف ہے' دین اور علم ایک دوسرے کی ضد ہیں اور علم اور دین میں ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کسی درست علمی بنیاد پر استوار نہیں۔

علمی نظریات کی دو اقسام ہیں۔ ایک قسم ۲×۲=۴ کی حد تک قطعی علمی حقائق ہیں جبکہ علمی نظریات کی دوسری قسم وہ ہے جس کی بنیاد تجربہ اور غور و فکر ہے۔

پہلی قسم میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں (نہ عقلی اور نہ ہی حسی) یہ امور مسلمات اور ناقابلِ اختلاف ہیں۔ ایسے مواقع پر دینی نص کی حقیقتِ عقلی (قطعی اور یقینی علم) کے حق میں تاویل کی جانی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جبر و تجسیم سے مربوط آیات کی حقائق عقلی کے حق میں تاویل کرتے ہیں جو خدا کے لئے جبر اور تجسیم کو محال سمجھتے ہیں۔

لیکن ایسے علمی نظریات جو بعض دینی نصوص سے متصادم ہیں' جیسے ڈارون کا نظریہ وغیرہ --- ان کے بارے میں کہنا چاہئے کہ یہ نظریات' ظنی علمی نظریات ہیں' کیونکہ ان کا اظہار کرنے والے حضرات کامل استقراء اور حاصل ہونے والے نتائج کی قطعیت کی بنیاد پر ان پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر کوئی دینی نص ان نظریات کی مخالف ہو تو اسکے معنی دین اور علم کا ٹکراؤ نہیں۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ دانشور اور اسکا فہم' دینی نص کا مخالف ہے اور ممکن ہے کہ حقیقت دینی نص میں پوشیدہ ہو۔

علمائے دین نے بھی ان نظریات کی اس بنا پر مخالفت کی ہے کہ یہ ناقص استقراء پر استوار اور کمزور نکات کے حامل ہیں۔ اسی طرح غیر دینی علما نے بھی ان کی مخالفت کی ہے۔ لہذا یہ دعویٰ درست نہیں کہ دین اور علم باہم متصادم ہیں۔ دین بھی بعض دینی نظریات کی مخالفت کرتا ہے جیسا کہ ظنی علم کے نظریات بھی کبھی کبھی ایک دوسرے سے ناموافق اور باہم غیر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر دین ایسے غیبی امور کی بات کرتا ہے جن کے انکشاف اور ان تک پہنچنے کا کوئی راستہ علم کے پاس نہیں ہے۔ مثلاً جنت و جہنم، عالم آخرت اور فرشتے وغیرہ وغیرہ--- علم براہ راست طور پر ان امور کی صحت کا فیصلہ نہیں دے سکتا، ساتھ ہی ساتھ ان کی نفی بھی نہیں کرتا اور یہ نہیں کہتا کہ غیب کا کوئی وجود نہیں۔ دین، ان امور میں غیر مستقیم (Indirect) طور پر علم کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ دین عقل کی مدد سے نبوت پر استدلال کرتا ہے اور جب عقل کے ذریعے نبوت ثابت ہو جاتی ہے تو اسکے لوازمات اور نتائج بھی ثابت کرتا ہے۔ لیکن علم، جس طرح بہت سے حقیقی امور تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اس طرح ان امور کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا، اسی کے ساتھ ساتھ ان کی نفی بھی نہیں کرتا۔ علم کہتا ہے کہ میرے پاس غیب کو جاننے کا کوئی راستہ نہیں۔

مختصر یہ کہ علم، دین کی نفی نہیں کرتا، ہر چند اس کے ثبوت کے لئے حسی اور طبیعی ذرائع کا مالک نہیں اور دین علمی اور عقلی حقائق کا انکار اور ان کی نفی نہیں کرتا، ہر چند بعض علمی نظریات سے اختلاف رکھتا ہے۔

سوال : کیا فقہی منابع (Sources) سے عدالت نامی کسی فقہی قاعدے کا استخراج کیا جا سکتا ہے ؟

جواب : عدالت کا مفہوم ایک نسبی مفہوم ہے اور اسکی ایسی متعین حدود مقرر نہیں کی جا

سکتیں جن کے مصادیق پر تمام لوگ متفق ہوں۔ اس عدم اتفاق کا سبب یہ ہے کہ عدل کے معنی ہر حقدار کو اسکا حق دینا ہے۔ اس بنیاد پر اس کے مصداق کو معین کیا جانا چاہئے۔ مثال کے طور پر حقوقِ بشر کے موضوع پر کچھ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان ہر اس کام کے سلسلے میں آزاد ہے جو اسکے ذاتی اور انفرادی پہلوؤں سے متعلق ہے اور اسکے جنسی اور جسمانی پہلو کے بارے میں کوئی اخلاقی قدر اور پیمانہ موجود نہیں، حتیٰ وہ خودکشی کرنے میں بھی آزاد ہے اور کسی کو اسکی آزادی پر پابندی لگانے یا اسے محدود کرنے کا کوئی حق نہیں۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہاری آزادی دوسروں کی آزادی کی حدود پر آکے ٹھہر جاتی ہے۔ یا یہ کہ انفرادی آزادی اس نقطے پر اختتام کو پہنچتی ہے جہاں سے اجتماعی آزادی کا آغاز ہوتا ہے۔

حق کا مسئلہ، ایسے فکری قواعد کے تابع ہے جو انسان، فطرت اور زندگی کے عمومی خطوط (Lines) کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں، نیز یہ پہلے سے ذہن میں موجود مادی اور معنوی فکری نظریات سے وابستہ ہے۔ کیونکہ مادّی نظریات اور معنوی نظریات حق کے بارے میں مختلف طرزِ فکر رکھتے ہیں۔ یہ اختلاف صرف دین اور سیکولرازم کے درمیان ہی نہیں بلکہ خود سیکولرازم میں بھی انسانی حقوق کے بارے میں متعدد طرزِ فکر ملتے ہیں۔ لہذا کیونکر ممکن ہے کہ ہم عدل کے بارے میں ایک ایسا تفصیلی عنوان پیش کر سکیں جو تمام نکتہ ہائے نظر کا احاطہ کرتا ہو اور تمام لوگوں کو اس میں عدل مجسم نظر آئے۔ کیونکہ جس چیز کو (مثلاً) ہم اپنے فکری مبانی کے لحاظ سے عدل سمجھتے ہوں ممکن ہے آپ اسے ظلم شمار کریں۔ اس اختلافِ نظر کا مشاہدہ ہم حقوقِ نسواں، حقوقِ اطفال، اور اجتماعی اور اقتصادی حقوق کے مسائل میں کرتے ہیں۔

فقہی منابع (Sources) میں بھی ہم عدالت کی تشخیص کے بارے میں فقہی نکتہ ہائے نظر کا اختلاف دیکھتے ہیں۔ مثلاً ایک فقہی نظریہ جو مشہور بھی ہے، مرد کے لئے اس

حق کا قائل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو شب زفاف سے لے کر اسکی موت تک گھر میں محبوس رکھ سکتا ہے۔ یعنی اسکی تمام ضرورتوں کو فراہم کرے لیکن اپنے رجحان اور مزاج کی وجہ سے اسکے گھر سے نکلنے پر پابندی لگادے۔ ایک دوسرا نظریہ یہ کہتا ہے کہ عورت صرف ۴ مہینے میں ایک مرتبہ اپنے شوہر سے مباشرت کا حق رکھتی ہے اور کبھی کبھی اس بارے میں حقیقتاً نہیں بلکہ صرف برائے نام حق صادق آتا ہے۔ دوسری طرف کچھ فقہا کی طرف سے ایک دوسری رائے پیش کی گئی ہے جو عورت کے گھر سے نکلنے کو مرد کے جنسی استمتاع کے حق سے مربوط سمجھتے ہیں۔ اور عورت کے لئے اس زمانے میں گھر سے باہر نکلنا جائز سمجھتے ہیں جس زمانے میں اسکا شوہر حقِ استمتاع کا مطالبہ نہیں کرتا۔

لہذا فقہی ماخذ سے قاعدۂ عدالت کا استخراج بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ یہ قاعدہ نہ تو فقہی استنباطات کی بنیاد قرار پاتا ہے اور نہ فقہی آراء و نظریات کے محصول (Pro-duct) کے بطور قبول کیا جاسکتا ہے۔

سوال : امام خمینیؒ اس بات کے معتقد تھے کہ حوزۂ علمیہ میں مروّج اجتہاد 'اجتماعی اور سیاسی احکام کے استخراج اور آج کے معاشروں کے انتظام وانصرام کے لئے کافی نہیں۔ امام خمینیؒ کے اس خیال کے بارے میں 'جنابِ عالی کی رائے کیا ہے ؟

جواب : ہم اس موضوع میں 'امام خمینیؒ سے مکمل متفق ہیں۔ کیونکہ مروّج اجتہاد کی کوشش یہ ہے کہ وہ آج کی زندگی کے مسائل کا صرف نصوص اور اسلامی روایات کی روشنی میں مطالعہ کرے 'بغیر موجودہ حقیقی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ جن میں ممکن ہے بہت سے موضوعات اور احکام کی بنیادوں میں تبدیلی واقع ہو چکی ہو اور مصلحت اور مفسدہ کی مانند معیار اور پیمانے ادل بدل گئے ہوں اور عناوینِ ثانویہ 'عناوینِ اولیاء کی جگہ پر آگئے ہوں۔

اسی طرح ہم یہ مشاہدہ بھی کرتے ہیں کہ مروّج اجتہاد اجتماعی احکام کی بہ نسبت

انفرادی احکام پر زیادہ زور دیتا ہے۔ کیونکہ اس وقت جو فقہ ہمارے سامنے موجود ہے وہ فقہِ افراد ہے، فقہِ مملکت، فقہِ معاشرہ اور فقہِ روابطِ اجتماعی نہیں۔ عصرِ حاضر میں بہت سے ایسے نئے روابط ' نظام' حالات' اور عناوین وجود میں آچکے ہیں جن کے سامنے (رائج حوزے کا) فقیہ خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔

لہذا ایک ایسا مجتہد جو چاہتا ہے کہ اپنے زمانے میں زندگی گزارے (اپنے زمانے کے مسائل کا اسلامی حل پیش کرے : مترجم) اسکے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کو پہچانے تاکہ موضوعات اور پیمانوں کا تعین کر سکے اور فردی اجتہاد کی بہت سی بنیادوں میں تجدید نظر کر سکے کیونکہ عصر حاضر میں وجود میں آنے والا وسیع و عریض اجتماعی دائرہ اس تجدیدِ نظر کا تقاضا کرتا ہے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ عموماً گزشتہ صدیوں کے فقہا نے ہر قسم کے جہادی عمل پر (اس دوران جانی نقصان کے خوف سے) اشکال کیا ہے' کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو عادی بنالیا تھا کہ جانی نقصان کے مسئلے میں (حتیٰ معاشرے کے انتہائی زندگی ساز مسائل میں بھی) احتیاط کریں۔ جبکہ آج کے حالات اور وجود میں آنے والی بکثرت تبدیلیاں ایک دوسرے انداز کی حکمتِ عملی اپنانے کا تقاضا کرتے ہیں۔

سوال : امام خمینیؒ کے نکتۂ نظر سے ولایتِ فقیہ کے نظریے اور ان کی قیادت میں حکومتِ اسلامی کے تجربے کے بارے میں آپ کا تجزیہ کیا ہے ؟

جواب : امام خمینیؒ کا پیش کردہ نظریۂ ولایتِ فقیہ بہت وسیع ہے۔ یہاں تک کہ وہ ولایتِ امام اور ولایتِ پیغمبرؐ سے جڑ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ولایتِ فقیہ کے موضوع سے متعلق جن نصوص پر اعتماد کرتے ہیں' ان سے استفادہ کرتے ہوئے اس ولایت کو حکومت کے سائے میں تمام انسانی پہلوؤں پر محیط سمجھتے ہیں۔ وہ حدیثِ (رسولؐ) : العلماء ورثة الانبیاء۔ (علما انبیاء کے وارث ہیں) کو بطور سند پیش کرتے ہوئے نتیجہ حاصل کرتے

ہیں کہ عالم کو پیغمبر کے تمام اختیارات حاصل ہیں اور اسی بنیاد پر انہوں نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور اس مسئلے پر متمرکز ہوئے ہیں کہ ولی فقیہ 'ولایت ہاتھ میں لینے اور اولی الامر (صاحبِ امر) بننے کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں پر ولایت رکھتا ہے اور ان کے تمام سیاسی اجتماعی اور اقتصادی امور میں مداخلت کر سکتا ہے اور انہیں اپنی آراء کا پابند کر سکتا ہے۔

امام خمینیؒ نے اپنی انقلابی تحریک کے دوران اس تجربے پر عمل کیا' جب انہوں نے لوگوں کو ظالم حکمران کے خلاف جدو جہد اور اسے گرانے کے لئے (حتیٰ جاں نثاری کی قیمت پر بھی) دعوت دی' یہاں تک کہ ولایت فقیہ کی بنیاد پر ایک حکومت قائم کی۔

امام خمینیؒ کا تجربہ ایک کامیاب تجربہ ہے۔ کیونکہ امام خمینیؒ نے ولایتِ فقیہ کے تصور کو اسکے بارے میں رائج اس مفہوم اور ذہنیت سے نجات دلائی جو اسے ایک فرد کی ایسی مطلق الہی حکومت قرار دیتا تھا' جو لوگوں پر حکومت کرتا ہے اور کسی کو اعتراض اور اشکال کا حق نہیں دیتا (جیسے قرونِ وسطیٰ کی تھیوکریسی) اور عوام کے اعتماد اور بھروسے پر ولایتِ فقیہ کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ولایت فقیہ اور نظامِ جمہوری اسلامی کے قیام اور اسے عملی کرنے کے لئے عوامی رائے (ریفرینڈم) پر اس قدر زور دیا کہ بہت سے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ امام خمینیؒ نے قانونِ اساسی (آئین) کو جو (اجتماع وسیاست کے بارے میں) اسلام کی عمومی ہدایات کا مظہر تھا' لوگوں کی رائے پر چھوڑا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ گویا امام عوام سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو اسلام قبول ہے یا نہیں؟ اس عمل کا کسی فقیہ سے سرزد ہونا انتہائی تعجب خیز تھا۔ اگرچہ قانونِ اساسی قانونی مواد پر مشتمل تھا لیکن اس میں اسلام کے کلیات کو جگہ دی گئی تھی اور قانونِ اساسی کے بارے میں عوامی رائے طلب کرنا ایسا ہی تھا جیسے اسلام کے بارے میں عوامی رائے طلب کی جائے۔ آئین کے بعد' صدرِ جمہوریہ' پارلیمنٹ وغیرہ جیسے ادارے بھی عوامی رائے کی بنیاد پر قائم کئے گئے۔ اور نظامِ اسلامی جو ولایت فقیہ کی بنیاد پر استوار تھا اس

نے اپنے اساسی پہلوؤں میں عوامی شرکت کی رنگ وبو لے لی۔ یہ امر دنیا کی اکثر حکومتوں' حتیٰ ترقی یافتہ دنیا میں بھی نظر نہیں آتا۔ خود امام خمینیؒ نے اس تدبیر کے ذریعے ولایتِ فقیہ کے نظریے کو مغربی معنی میں مطلق تھیوکریسی کے گڑھے میں ڈوبنے سے بچالیا۔ اگر نظام ولایتِ فقیہ میں' فقیہ کو عوام الناس کی رائے کی توثیق کرنا پڑی تو امام خمینیؒ نے اپنی قیادت کے دور میں کبھی بھی' کسی بھی عوامی رائے پر اعتراض نہ کیا' اس پر تنقید نہیں کی بلکہ ان سب کو قبول کیا اور شوریٰ کے نظریے کو وسعت دی اور مشورت کو فقط اربابِ حل و عقد تک محدود کرنے کی بجائے یہ قرار دے کر کہ لوگوں کی کثرتِ رائے کی بنیاد پر عمل کیا جائے اسے عوام الناس کی شرکت کے میدان میں تبدیل کیا۔ امام خمینیؒ نے عنوانِ ثانوی کے لحاظ سے اسلام کی اہم مصلحت قرار دیتے ہوئے مجلس شورائے اسلامی (پارلیمنٹ) کو جمہوریت کی بنیاد پر قائم کیا۔

امام خمینیؒ کی حکومتِ اسلامی کے تجربے کی ایک اور خصوصیت' عوام کے سامنے اہلکاروں پر تنقید تھی۔ جب کبھی کوئی اہلکار فکری یا عملی لحاظ سے کسی خطا کا مرتکب ہوتا' تو امام خمینیؒ عوام کے روبرو اس پر تنقید کرتے اور کوئی چیز لوگوں سے پوشیدہ نہ رکھتے۔ بلکہ اس عہدیدار کو مخاطب کر کے کہا کرتے کہ تم نے غلطی کی ہے اور تمہیں اس کا ازالہ کرنا چاہئے۔

امام خمینیؒ نے مطلق العنان حکمرانوں کی مانند عمل نہیں کیا حتیٰ جمہوری حکومتوں کے بعض لیڈروں کی طرح بھی حکومت نہیں کی جو اعلیٰ عہدیداروں کی غلطیوں کو عوام سے چھپاتے ہیں اور اس مسئلے پر ان سے پس پردہ گفتگو کرتے ہیں۔

اس بنیاد پر ہمارا عقیدہ ہے کہ ولایت کی عمومی روش میں امام خمینیؒ کا تجربہ' ایک ممتاز انسان کا تجربہ ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ' اس بات کے پیش نظر کہ امام خمینیؒ اپنی شخصیت اور تجربے میں معصوم نہ تھے اور اس تجربے میں ان کے رفقائے کار بھی معصوم نہ

تھے لہذا مسائل کے تجزیے اور تحلیل میں ہمیں امام خمینیؒ کے نکتہ ہائے نظر پر توقف نہیں کر لینا چاہئے بلکہ اسی طرح محققانہ نظر سے انہیں دیکھنا چاہئے جس طرح فقہی مباحث میں بعد میں آنے والے فقہا محققانہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم غلطیوں کی کھوج میں لگ جائیں' بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہمیں چاہئے کہ قائدین کی فکر و عمل کے جائزے کے دوران لائحۂ عمل اور اندازہائے فکر کا مطالعہ اور ان کے وزن کا جائزہ لیں اور سامنے آنے والے نئے تجربات اور تازہ تبدیلیوں کو نظر میں رکھیں تاکہ فکر و نظر کسی معین شخص کے نام پر متوقف اور منجمد ہو کر نہ رہ جائے۔

سوال : میدانِ حیات اور انسانی معاشرے میں حاکمیتِ الٰہی کے کیا معنی ہیں ؟

جواب : فطری طور پر فکرِ اسلامی' عقیدے اور شریعت کی بنیاد پر استوار ہے۔ عقیدتی لحاظ سے کائنات کا وجود خداوند عالم سے تعلق رکھتا ہے۔ وہی ہے جو خالق کے عنوان سے کائنات پر حکمراں ہے' وہی ہے جس کی قدرت کا سایہ تمام موجودات پر چھایا ہوا ہے' اور جو ہم سے' خود ہم سے زیادہ آگاہ تر اور ہم پر' خود ہم سے زیادہ توانا تر ہے اور ہم سے زیادہ ہمارے بھلے برے سے آگاہ ہے : الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر (اور کیا پیدا کرنے والا نہیں جانتا ہے ؟ جب کہ وہ باریک بین اور بڑا باخبر بھی ہے۔ سورۂ ملک ۶۷- آیت ۱۴)۔ لہذا حاکمیتِ تکوینی خدا کے لئے مخصوص ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارا وجود ارادۂ الٰہی کے تابع ہے۔ یہ امر اصلِ توحید اور شرک کی نفی سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری طرف تشریع (قانون سازی) کے مفہوم میں خداوند عالم کی حاکمیت درج ذیل آیات کے ذریعے درک کی جاسکتی ہے :

«وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ و رسولہ امرا ان یکون لھم الخیرة من امرھم۔»

«اور کسی مومن مرد یا عورت کو حق نہیں ہے کہ خدا اور رسول کے کسی امر

کے بارے میں فیصلہ کر دینے کے بعد وہ بھی اس امر کے بارے میں صاحبِ اختیار بن جائے۔»(سورۂ احزاب ۳۳-آیت ۳۶)

«فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجربینھم ثم لا یجد وافی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔»

«پس آپ کے پروردگار کی قسم یہ ہر گز صاحبِ ایمان نہ بن سکیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں اور پھر جب آپ فیصلہ کر دیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی (اور شک و شبہ) کا احساس نہ کریں اور آپ کے فیصلے کے سامنے سراپا تسلیم ہو جائیں۔»

(سورۂ نسا۴-آیت ۶۵)

«ثم جعلنا ک علی شریعة من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون۔»

«پھر ہم نے آپ کو اپنے حکم کے واضح راستے پر لگا دیا لہذا آپ اسی کا اتباع کریں اور خبر دار جاہلوں کی خواہشات کا اتباع نہ کریں۔»

(سورۂ جاثیہ ۴۵-آیت ۱۸)

مزید آیات بھی پائی جاتی جن میں حاکمیت کے صرف خدا کی ذات میں منحصر ہونے اور جو لوگ احکامِ الٰہی کے مطابق حکومت نہیں کرتے ان کے کافر اور ظالم ہونے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم ہم سے چاہتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں خدا کی عبودیت کے تقاضوں کے تحت اطاعت اور عمل میں اسکی شریعت کی راہ پر چلیں۔ خداوندِ عالم ایسی انسانی حیات کو پسند کرتا ہے جو نظامِ کائنات سے ہم آہنگ ہو اور چاہتا ہے

کہ عالمِ کائنات' تکوینی صورت میں اور انسانی حیات تشریعی لحاظ سے ارادۂ الٰہی کے تابع ہو۔ اسی صورت میں شریعت کے اوامر ونواہی کا تابع انسان اور سننِ الٰہی کی پابند کائنات جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے' ایک دوسرے کی تکمیل کریں گے۔ لہذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شریعتِ الٰہی کے مقابل کوئی اور شریعت اور قانون وضع کرے' یا خداوند متعال کی طرف سے حکومت اور قانون کے مسئلے میں وضع کردہ خطوط (Lines) سے تجاوز کرے۔

البتہ اس گفتگو کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان اس وسیع احاطے میں جس کا اختیار خداوند عالم نے معین مقررات کے ضمن میں انسان کے سپرد کیا ہے یا ان امور میں جن کی جزیات کے تعین و تشخیص کا انسان کو مجاز قرار دیا ہے ان میں حکومت اور قانون سازی کا حق نہیں رکھتا۔ حاکمیتِ الٰہی کے معنی انسانوں کو جمود میں مبتلا کرنا نہیں کہ وہ صرف حاکمیتِ خدا کے نعرے پر سر دھنتے رہیں بغیر اسکے کہ انسانی زندگی کی جزیات میں اسکے علمی اصول مشخص ہوں۔ خداوند عالم انسان کے ذریعے حکومت کرتا ہے۔ انبیاء' اولیاء اور ان لوگوں کے توسط سے حکومت کرتا ہے جو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ لہذا انسان پر انسان کی حکومت ناگزیر ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو لوگوں پر حکومت کرتے ہیں' یا لوگ جنہیں حکومت کے لئے منتخب کرتے ہیں انہیں ایسی صفات کا مالک ہونا چاہئے جنہیں خداوندِ عالم زندگی اور معاشرتی امور کے قائدین کے لئے پسند کرتا ہے۔

اس بنیاد پر اسلام میں حکومت کے نظریے (چاہے یہ نظریہ امامت کی سطح پر ہو یا خلافت کی یا نظریۂ شورا کی کہ جو بسا اوقات ان ضوابط کے لحاظ سے جو بعض فقہا اور اسلامی مفکرین نے وضع کئے ہیں امامت اور خلافت کے نظریات سے وسیع تر دائرہ رکھتا ہے) پر تحقیق کے دوران ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ خداوند عالم کی حاکمیت سے مراد یہ نہیں ہے کہ معاشرے پر خدا کی حکومت ہے۔ یعنی حاکم حدود و قواعد سے ماوراء نہیں' ظلِ

الٰہی نہیں کہ طاقت و حکومت اسکے لئے ایک ذاتی ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے حتیٰ انبیاء کے لئے بھی (جو نبوت و خلافتِ الٰہی کے لئے ایک اعلیٰ ترین انسانی نمونہ ہوتے ہیں) کچھ حدود و قوانین مقرر کئے ہیں اور پیغمبر بھی اپنے ذاتی رجحان اور طرز فکر کے مطابق حکومت نہیں کر سکتا۔ ہر چند ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ نبی کا طرزِ فکر اور انداز بھی خداوند عالم کی طرف سے اسے ودیعت کی گئی قداست اور عصمت کے سبب ارادۂ الٰہی سے جدا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حکومت کو ذاتی اور شخصی مسئلہ قرار نہیں دیا ہے' بلکہ اسے ایک خط' لائحۂ عمل اور ادارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ خداوندِ متعال اس بارے میں اپنے پیغمبر (یا پیغمبروں) سے اسی انداز میں گفتگو کرتا ہے جس انداز میں دوسرے انسانوں سے بات کرتا ہے :ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک۔ (اور یقیناً تمہاری طرف اور تم سے پہلے والوں کی طرف یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمہارے تمام اعمال برباد کر دیئے جائیں گے۔ سورۂ زمر ۳۹- آیت ۶۵)ولو تقول علینا بعض الا قاویل لا خذنا منه بالیمین ثم لقطعنا منه الوتین۔ (اور اگر (پیغمبر) ہماری طرف سے کوئی بات گڑھ لیتا تو ہم اس کے ہاتھ کو پکڑ لیتے اور پھر اسکی شہ رگ کاٹ دیتے۔ سورۂ حاقہ ۶۹- آیات ۴۴ تا ۴۶)

لہذا اسلامی حکومت تھیوکریسی نہیں ہے' جیسے کہ کچھ لوگ حکومتِ الٰہی کی اصطلاح سے یہی معنی اخذ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حکومتِ الٰہی کے معنی ایسی شخصی حکومت ہے جو فردِ واحد کے طرز فکر اور فیصلوں کے مطابق چلائی جاتی ہے اور اسکے اوپر کنٹرول کرنے والا کوئی عامل وجود نہیں رکھتا' اور کسی کو اس پر اعتراض اور تنقید کا حق نہیں ہوتا۔

ایسی حکومت' اسلام کی مطلوب حکومت نہیں۔ اللہ رب العزت اپنے پیغمبر کو بھی (جو اگرچہ منبعِ وحی سے رابطے میں ہیں) حکم دیتا ہے کہ وہ لوگوں سے مشورہ کریں :

وشاور هم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔(اور معاملات میں ان سے مشورہ کرو اور جب فیصلہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ سورۂ آل عمران ۳-آیت ۱۵۹)

لہذا اسلام میں حکومت ایسے زمینی حقائق سے سر چشمہ لیتی ہے جن میں حاکم اور رہبر شخص ان ضوابط کی بنیاد پر حکومت کرتا ہے جو حاکم کے عمل کو جانچنے اور پرکھنے اور ان ضوابط سے اسکی ہم آہنگی یا عدم ہم آہنگی کا جائزہ لینے کا امکان فراہم کریں۔ حاکم کی حکومت، مطلق حکومتِ الہیہ نہیں، بلکہ ایسی انسانی حکومت ہے جو اپنا جواز خداوند عالم کی طرف سے حکومت کے لئے قرار دیئے گئے رہنما خطوط سے حاصل کرتی ہے۔

حضرت محمدؐ کی سیرت میں (جو خداوند متعال کی جانب سے تبلیغ اور اپنے عملی کردار میں معصوم از خطا تھے اور ان کی سنت یعنی ان کی گفتار، عمل اور تائید حجت ہے) ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ اپنی زندگی کے آخری ایام میں لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے فرماتے ہیں :انکم لا تمسکون علی بشیٔ اننی ما احللت الاّ ما احلّ اللہ وما حرّمت الا ما حرّم اللہ۔(اے لوگو تم میری طرف کسی چیز کی نسبت نہ دینا۔ کیونکہ میں نے خدا کی طرف سے حلال کی گئی چیزوں کے سوا کسی اور چیز کو حلال نہیں کیا ہے اور خدا کی طرف سے حرام کی گئی چیزوں کے سوا کسی اور چیز کو حرام قرار نہیں دیا ہے۔)

گویا پیغمبرؐ ان سے کہنا چاہتے ہیں کہ میری پوری زندگی اور دعوت و تبلیغ اور حکومت کے سلسلے میں میری تمام سرگرمیوں کا جائزہ لو، اور انہیں اس شریعت کی روشنی میں پرکھو جسکی میں نے تمہیں تبلیغ کی ہے، تاکہ تمہیں پتا چل جائے کہ میرے تمام کلمات، اعمال اور روابط اس شریعت سے ہم آہنگ تھے۔

نتیجہ یہ کہ اسلامی حکومت، ایک ایسی انسانی حکومت ہے جو اپنا جواز اور مطابقِ شرع ہونا خداوند عالم کی طرف سے حکومت اور حاکم کے لئے مقرر کردہ حدود و ضوابط اور احکام

وفرامین سے حاصل کرتی ہے۔

سوال : خدا کی منشااور لوگوں کی طرف سے حکومت کے جواز کو کس طرح یکجا کیا جاسکتا ہے اور اس بنیاد پر امام خمینیؒ کا عوامی مشارکت پر زور دینا' جبکہ اسکے ساتھ ہی ساتھ آپ منشائے الٰہی پر بھی عقیدہ رکھتے تھے' کس طرح قابلِ توجیہ ہے ؟

جواب : سنگین غلطی ہو گی اگر ہم ولایتِ فقیہ کو فقیہ کی قداست سمجھنے لگیں اور یہ تصور کرنے لگیں کہ فقیہ خطا نہیں کرتا۔ ولیٔ فقیہ دوسرے افرادِ بشر ہی کی مانند انسان ہے اور دوسرے مجتہدین ہی کی مانند ایک مجتہد ہے' جن کی رائے خطا بھی ہو سکتی ہے اور صواب بھی۔ اگر اسکی رائے صواب ہو' تو لوگوں کو اسکی پیروی کرنی چاہئے اور اگر وہ خطا کرے' تو اسے اپنی رائے سے رجوع کرنا چاہئے اور لوگوں کو بھی چاہئے کہ اسے اسکی خطا سے آگاہ کریں۔

پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ اپنی خواہشِ نفس سے کلام نہیں فرماتے تھے : ان ھوالا وحی یوحٰی۔ (اس کا کلام وہی وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے۔ سورۂ نجم ۵۳ - آیت ۴) لیکن اسکے باوجود آپؐ خود کو لوگوں کے سامنے احتساب کے لئے پیش کرتے ہیں اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کی تمام زندگی پر نظر دوڑائیں' اسکا تنقیدی جائزہ لیں اور قرآنی تعلیمات اور ان کی عملی سیرت کا آپس میں موازنہ کریں اور دیکھیں کہ ان کا پیغمبرؐ عین قرآن کے خط پر گامزن ہے' اس سے سرِ مو منحرف نہیں ہوا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ خداوندِ عالم اپنے نبیؐ کو لوگوں سے مشورت کی وصیت کرتا ہے : وشاور ھم فی الامر فاذ اعزمت فتوکل علی اللہ (اور معاملات کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرو اور جب فیصلہ کر لو تو خدا پر بھروسہ کرو۔ سورۂ آلِ عمران ۳ - آیت ۱۵۹)

اسی طرح حضرت علیؑ کے کلمات میں پڑھتے ہیں کہ :

«فلا تکلمونی بما تکلم به الجبابرة ولا تتحفظوا منی بما یتحفظ به عند اهل البادرة ولا تخالطونی بالمصانعة ولا تظنوابی استثقالاًفی حق قیل لی ولا التماس اعظام لنفسی فانه من استثقل الحق ان یقال له اوالعدل ان یعرض علیه کان العمل بهما اثقل علیه فلا تکفوا عن مقالة بحق او مشورة بعدل فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطی ء ـ»

«دیکھو' مجھ سے اس لب و لہجے میں بات نہ کرنا جس لب و لہجے میں ظالم بادشاہوں سے بات کی جاتی ہے اور نہ ہی مجھ سے اس طرح بچنے کی کوشش کرنا جس طرح غصہ ور لوگوں سے بچا جاتا ہے۔ نہ مجھ سے اس انداز کا میل ملاپ رکھنا جس سے چاپلوسی اور خوش آمد کا پہلو نکلتا ہو اور نہ میرے بارے میں یہ تصور کرنا کہ مجھے حرفِ حق سننا گراں گزرے گا' اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ میری ذات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ اس لئے کہ جو شخص حرفِ حق سننے کو گراں سمجھتا ہے' یا عدل پیش کئے جانے کو ناپسند کرتا ہے' اسکے لئے حق اور عدل پر عمل کرنا تو کہیں زیادہ دشوار ہو گا۔ لہذا خبردار حرفِ حق کہنے میں تکلف نہ کرنا' اور منصفانہ مشورہ دینے سے گریز نہ کرنا' اس لئے کہ میں ذاتی طور پر خود کو ارتکابِ خطا سے بالاتر نہیں سمجھتا۔» (نہج البلاغہ - خطبہ ۲۱۴)

نہج البلاغہ میں مذکور اس صریح نص پر غور فرمایئے' امامؑ لوگوں سے چاہتے ہیں کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے وہ صاف صاف ان کے سامنے بیان کریں۔ باوجود یہ کہ ہمارے

عقیدے کے مطابق امامؑ معصوم ہیں لیکن آپؑ لوگوں کا فریضہ قرار دیتے ہیں کہ وہ حاکم پر نظر رکھیں اور اس کے خیر خواہ ہوں اور حاکم پر بھی فرض قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے حکم کو (اگرچہ وہ مقدس ہو تب بھی) مقدس نہ سمجھے' کیونکہ یہ عمل اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ لوگوں کی باتوں پر کان دھرنا چھوڑ دیتا ہے اور لوگوں سے مکالمے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔

لہذا ہمیں ولیٔ فقیہ کے لئے اس مقام و مرتبے سے زیادہ کا قائل نہیں ہونا چاہئے جو اسے اسلام نے دیا ہے۔ اس لحاظ سے خداوندِ عالم کی طرف سے حقِ حاکمیت اور خطا کی صورت میں عوام کی اس پر تنقید کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ عوام کو حاصل فقیہ پر تنقید کا حق' حکومت کی سلامتی کا ضامن ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد پر استوار ہے۔

ولایتِ فقیہ کے معنی' ولیٔ فقیہ کی خطاؤں کا مقدس ہونا نہیں ہے۔ بلکہ اسکے معنی ان مقامات پر ولیٔ فقیہ کی اطاعت ہے' جہاں وہ احکامِ الٰہی کی بنیاد پر حکم صادر کرے اور اسکی خطا سامنے نہ آئی ہو۔ لیکن اگر (ولیٔ فقیہ) منحرف ہو جائے تو امت پر واجب ہے کہ اسے ولایت سے معزول کر دے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ حقِ اطاعت کھو بیٹھتا ہے۔ اور امت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے فقیہ کی اطاعت کرے جو فاسق ہو گیا ہو' یا اجتہاد کے راستے سے خارج ہو گیا ہو یا فیصلوں میں اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو داخل کرتا ہو۔

یہ مباحث ایک نقطے پر ختم ہونے چاہئیں اور وہ نقطہ یہ ہے کہ ہمیں چاہئے کہ اسلامی تعلیمات کو اچھی طرح اور ان کی اصل شکل میں عوام الناس تک پہنچائیں اور نظریۂ ولایت فقیہ کو ایسی تفصیل اور شرح کے ساتھ واضح کریں جو اسلامی اصولوں کے مطابق اور ولیٔ فقیہ کے حوالے سے غیر حقیقی تصورات سے دور ہو۔ اس بنیاد پر ولیٔ فقیہ ایک مجتہد' عادل' اپنے زمانے کے حالات سے باخبر' عوام کی نظر میں صاف ستھرے کردار کا مالک' اور

اپنی خطاؤں اور غلطیوں پر کسی نقد وانتقاد اور تند و تلخ لہجے پر رنجیدہ خاطر نہ ہونے والا انسان ہے' ایک ایسا انسان ہے جو لوگوں سے چاہتا ہے کہ حق و عدالت کی معرفت اور انسانوں کی فلاح اور بھلائی کے سلسلے میں اس کی مدد کریں۔

اسے اپنے عہدیداروں کو آگاہ کرنا چاہئے کہ اگر عوام اور ان کے درمیان گفتگو کا تبادلہ ہو اور کوئی بحث چھڑ جائے تو وہ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ لوگ ان سے لبرلزم اور سوشلزم پر عمل کے خواہاں ہیں جبکہ عوام اور عہدیدار دونوں ہی اسلامی بنیادوں پر اشتراکِ رائے رکھتے ہوں۔ پس گفتگو اور اختلاف اس بارے میں ہونا چاہئے کہ آیا فلاں عمل اسلام کے موافق ہے یا اسکے مخالف۔ اور اگر اسکی تشخیص میں اختلافِ نظر پایا جائے تو اس سلسلے میں علمی اداروں اور حلقوں میں گہری علمی گفتگو کا آغاز کریں' اور ولایتِ فقیہ اور اسکی وسعت اور دائرے کے باب میں صحیح اسلامی نکتۂ نظر حاصل کریں۔

تند مزاجی اور شدت پسندی کے ہمراہ ہونے والی اکثر بحث و مباحث میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ مباحث ایسے لوگوں کی طرف سے اٹھائی جاتی ہیں جو ان کے بارے میں گہرے علمی مبانی سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اسلامی قوانین واحکام کی روح سے آشنا نہیں ہوتے۔

سوال :جب حکومت کے سلسلے میں فقیہ کو شرع کی جانب سے جواز حاصل ہے تو پھر لوگوں کی طرف سے جواز کے حصول اور عوامی رائے کی کیا ضرورت ہے ؟

جواب :اگر چند مجتہدین ولایت کے اہل ہوں' تو ولیٔ فقیہ کا تعین کون کرے گا ؟ قدرتی بات ہے کہ عوام اسے معین کریں گے۔ جب عوام کسی ایک کا انتخاب کرلیں تو اقتدار اس منتخب شخص کے ہاتھ میں آجائے گا اور وہ ولیٔ فقیہ بن جائے گا۔

لوگوں کا کام شرعی جواز فراہم کرنا نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ ولیٔ فقیہ کو عوام کے ووٹوں سے شرعی جواز حاصل ہوتا ہے بصورتِ دیگر اسکی کوئی حیثیت نہیں۔ ممکن ہے کوئی

شرعی قابلیت کا مالک ہو لیکن عوام اسے قبول نہ کریں۔ ایسی صورت میں وہ عملاً اور فعلاً حاکمیت حاصل نہیں کرپاتا۔

یہاں شرعی جواز سے ہماری مراد 'اس کے دینی معنی ہیں عوامی مقبولیت نہیں۔ البتہ دونوں طرح کے جواز کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ ولیٔ فقیہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو شرعی اہلیت رکھنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی جانب سے قبول کیا ہوا بھی ہے' چاہے اس کی صورت ووٹنگ ہو' چاہے اجماع اور عوام کے قطعی اظہارِ اعتماد کی صورت ہو جیسا کہ امام خمینیؒ کے بارے میں ہوا تھا۔

آخر میں ہم اس بات کی جانب اشارہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ اتفاقِ نظر نہیں رکھتے جو ولایتِ فقیہ کو اس موضوع کے بارے میں آنے والی نصوص سے (جو دلیل ہو سکتی ہیں) مستند و مستدل سمجھتے ہیں۔ ہم ولایتِ فقیہ کو نظامِ اجتماعی کی حفاظت (اگر اس نظام کی حفاظت ولایتِ فقیہ پر موقوف ہو) کے لحاظ سے قبول کرتے ہیں۔

اس مقام پر ایک قابلِ توجہ نکتہ پایا جاتا ہے جس پر علما کو تحقیق و تجزیہ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ اگر ولیٔ فقیہ کے چناؤ کے سلسلے میں عوامی رائے پر بھروسہ کیا جائے تو سوال یہ پیش آتا ہے کہ ولیٔ فقیہ کے تعین کے سلسلے میں عوامی رائے کے اعتبار کی صورت میں' کسی ایک معین ملک کے لوگوں کے ذریعے کسی فقیہ کا انتخاب' کس طرح اسے پوری دنیا کے لوگوں کا ولی قرار دیتا ہے جبکہ ان لوگوں نے اس کے انتخاب میں حصہ نہیں لیا ہے۔

دوسرے سوالات بھی اٹھتے ہیں کہ مثلاً یہ شرط کیوں ہونی چاہئے کہ ولیٔ فقیہ صرف ایک معین قوم سے ہو؟ ان سوالات کے جواب دیئے جانے چاہئیں۔ کچھ لوگ ان سوالات کو خلوصِ نیت کے ساتھ اٹھاتے ہیں اور ممکن ہے بعض لوگ غلط مقاصد کے لئے اس قسم کے سوالات اٹھائیں۔ لیکن بہر حال ان سوالات کے علمی اور اطمینان بخش جوابات

دیئے جانے چاہئیں۔ کیونکہ آج نظریۂ ولایتِ فقیہ کا شمار ان نظریات میں ہوتا ہے جنہیں دنیا جاننا اور سمجھنا چاہتی ہے۔

☆☆☆

حکومتِ اسلامی، شوریٰ اور جمہوریت

یہ انٹرویو حوزۂ علمیہ قم المقدس، ایران سے شائع ہونے والے مجلّے «علوم سیاسی» سے لیا گیا۔

حکومتِ اسلامی، شوریٰ اور جمہوریت

اسلام اور حکومت

سوال : اسلام حکومت اور اقتدار کو کس نظر سے دیکھتا ہے ؟

جواب : اسلام میں حکومت کے مقام کو واضح کرنے والے متنوع و مختلف مصادر کا مطالعہ بالخصوص پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ معصومینؑ کی سیرت کا جائزہ نیز ان نظریات کی بنیاد پر جو حکومت و اقتدار میں فقیہ کے کردار کے قائل ہیں، فقیہ کے کردار کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام حکومت کو ایک ایسا اجتماعی فریضہ سمجھتا ہے جس کی بنیاد پر سربراہ حکومت معاشرتی مسائل کے حل و فصل کے سلسلے میں اسلامی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے عمل کا پابند ہے۔ یہاں تک کہ رہبر و قائد کو کسی بھی صورت میں اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اسلام کے وضع کردہ حکومتی اصول و قواعد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اقتدار کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرے۔

جب ہم رسول کریم کی حیات طیبہ کے آخری ایام کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں نظر آتا ہے کہ لوگوں کے سامنے آنحضرتؐ اپنے آپ کو محاسبے کے لئے پیش کرتے ہیں، جبکہ امرِ نبوت آپؐ کو عوام کے سامنے جوابدہ قرار نہیں دیتا، کیونکہ آپؐ خدا کے فرستادہ اور اسکے نمائندہ ہیں۔ لیکن جب پیغمبر لوگوں کے سامنے آتے ہیں اور خود کو محاسبے کے لئے

پیش کرتے ہیں تو اس موقع پر دراصل آپؐ سربراہ حکومت اور حاکم کے عنوان سے لوگوں سے کلام فرماتے ہیں اور انہیں حکومت اور رسالت کے راستے کی ہم آہنگی سے آگاہ کرتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں :ایھا الناس لا تعلقون علی بشئی انی ما احللت الا ما احل القران وما حرمت الاما حرم القرآن۔(اے لوگوں مجھ سے کوئی (غیر واقع) چیز منسوب نہ کرنا' میں نے صرف اسی چیز کو حلال بیان کیا ہے جسے قرآن نے حلال کہا ہے اور اسی چیز کو حرام بتایا ہے جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔)

یہ نص ہمیں بتاتی ہے کہ حکومت پر فائز قیادت کا (حتیٰ اگر قیادت پیغمبرؐ کے ہاتھ میں ہو تب بھی) عوام سے تعلق اور ارتباط لازم ہے۔ یعنی حاکم ہر طرح کی قید و بند سے آزاد نہیں ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ((بیعت)) جس کا مسلمانوں سے تقاضا کیا جاتا ہے (جس کے تحت مرد و زن پیغمبر اکرمؐ کی بیعت کرتے تھے) اسلام کی نظر میں حکومت یا نبوت کے شرعی جواز کی بنیاد نہیں۔ بلکہ رہبر کے دیئے ہوئے کلی یا جزوی پروگرام کی اساس پر لوگوں کی اس سے وفاداری کا اظہار ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ اپنے پیش کئے ہوئے پروگرام کی بنیاد پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے نہ کہ اپنی ذات اور شخصیت کی بنیاد پر۔ وہ قرآنی نص جس میں عورتوں کے پیغمبر اسلامؐ کی بیعت کرنے کا تذکرہ ہوا ہے اس میں بھی ہم اسی امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ان سے اجتماعی میدان میں فعالیت کی بنیاد پر بیعت لی۔

اگر اس امر کو پیش نظر رکھا جائے تو ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام کی نظر میں رہبر کو حاصل قدرت و اختیار اس لحاظ سے نہیں ہے کہ وہ رہبری کے امتیازی مقام پر فائز ہے (چاہے اسے حاصل یہ فوقیت عوام کی دی ہوئی نہ ہو جیسے نبوت یا امامت کے عنوان سے فائق ہونا جو پیغمبر یا امام کو حاصل امتیاز ہے)۔ اپنے اس مدعا کے

دلائل ہمیں مولا علیؑ کے کلام میں بھی ملتے ہیں' آپؑ پروردگار عالم سے اپنی مناجات میں، فرماتے ہیں :

«اللھم انک تعلم انه لم یکن الذی کان منامنا فسة فی سلطان' ولا التماس شی ء من فضول الحطام' ولکن لنرد المعالم من دینک' و نظھر الاصلاح فی بلادک' فیا من المظلومون من عبادک۔»

«خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے جو کچھ انجام دیا اس میں مجھے نہ سلطنت کی لالچ تھی اور نہ مال دنیا کی تلاش۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ دین کے (مٹے ہوئے) آثار کو لوٹاؤں اور شہروں میں اصلاح پیدا کروں تاکہ تیرے مظلوم بندے محفوظ ہو جائیں۔» (نہج البلاغہ - خطبہ ۱۲۹)

ایک دوسرے مقام پر یوں فرماتے ہیں :

«لولا حضور الحاضر ' وقیام الحجة بوجود الناصر' وما اخذ اللہ علی العلماء ان لا یقارواعلی کظة ظالم ' ولا سغب مظلوم' لا لقیت حبلھا علی غاربھا ' ولسقیت آخر ھابکاس اولھا۔»

«اگر حاضرین کی موجودگی اور ناصر و مددگار افراد کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور اللہ کا اہل علم سے یہ عہد و پیمان پیش نظر نہ ہوتا کہ خبردار ظالم کی شکم سیری اور مظلوم کی بھوک پر چین سے نہ بیٹھ رہنا تو میں ناقۂ خلافت کی لگام کو اسی کی گردن پر ڈال کر ہنکا دیتا اور اسکے آخر کو اول ہی کے کلمے سے سیراب کرتا۔» (نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

اور وہ روایت جس میں آپؑ حکومت کو اپنی پھٹی ہوتی جوتی سے بھی حقیر قرار دیتے

ہوئے فرماتے ہیں :

«واللہ لھی احب الی من امرتکم' الا ان اقیم حقا اوادفع باطلا۔»

«خدا کی قسم یہ (جوتی) مجھے تمہاری حکومت سے زیادہ عزیز ہے اگر میرے پیش نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہو۔» (نہج البلاغہ - خطبہ ۳۳)

یہ روایات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہیں کہ حکومت (حتیٰ اگر حاکم امامت جیسے امتیازی مقام کا حامل ہو تب بھی) ایک فریضہ ہے' جس کی بنیاد پر حاکم اسلام کی دکھائی ہوئی رواہ وروش اور پروگرام کو جامۂ عمل پہنانے کی جدو جہد کرتا ہے' نہ کہ اپنی شخصیت کے تفوق کے اظہار اور اپنے ذاتی پروگرام کے اجرا کے لئے۔

امامؑ اس اسلامی پروگرام کی اساس پر لوگوں کی قیادت کا بیڑا اٹھاتے ہیں جس پر آپؑ ایمان رکھتے ہیں اور جس کی بنا پر معاشرے کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں' اور لوگ اس پروگرام کے معتقد ہیں۔ آپؑ کی جدو جہد کا محور دینی تعلیمات کا احیاء' زمین پر امن و بہبود کی فضا کا قیام' ستم رسیدہ افراد کو امن و آشتی کی فراہمی اور حق کا استحکام اور باطل کی نابودی ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی حکمراں امت سے اپنے خطاب اور حکومت کے مسئلے پر گفتگو کے دوران' اس بات پر زور دیتا ہے کہ امت اسکی کارکردگی پر نظر رکھے' ہر چند وہ ایک ایسے مقام پر فائز ہو جہاں اس کی حکومت یا عدالت کے شرعی جواز کے لئے (اسکے معصوم ہونے کی بنا پر) لوگوں کی نظارت کی ضرورت نہ ہو۔

حکمران اسلام کے فراہم کردہ پروگرام کا تابع' مطیع اور پابند ہوتا ہے لہذا وہ لوگوں کی نامناسب خواہشات اور مطالبات کے پیش نظر اسلامی اصولوں سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس مفہوم کو امیر المومنینؑ نے یوں بیان فرمایا ہے :

«ولیس امری و امرکم واحدا' انی اریدکم للّٰہ وانتم تریدو ننی لا نفسکم۔»

«اور میرا اور تمہارا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ میں تمہیں اللہ کے لئے چاہتا ہوں اور تم مجھے اپنے ذاتی فائدہ کے لئے چاہتے ہو۔»

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۳۴)

اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ امامؑ حکومتی معاملات میں اپنی مدد و اعانت کے لئے لوگوں سے درخواست کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ آپؑ پر تنقید و انتقاد کریں' فرماتے ہیں :

«فلا تکلمو نی بما تکلم به الجبابرة ولا تتحفظوا منی بما یتحفظ به عند اهل البادرة' ولا تخالطونی بالمصانعة' ولا تظنوابی استثقالا فی حق قیل لی' ولا التماس اعظام لنفسی' فانه من استثقل الحق ان یقال له اوالعدل ان یعرض علیه' کان العمل بهما اثقل علیه' فلا تکفوا عن مقالة بحق' اومشورة بعدل ' فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطی۔»

«دیکھو مجھ سے اس لب و لہجے میں بات نہ کرنا جس میں جابر بادشاہوں سے بات کی جاتی ہے۔ اور نہ ہی مجھ سے اس طرح بچنے کی کوشش کرنا جس طرح غصہ ور لوگوں سے بچ بچاؤ کیا جاتا ہے' نہ مجھ سے اس طرح کا میل ملاپ رکھنا جس سے چاپلوسی اور خوش آمد کا پہلو نکلتا ہو اور نہ میرے بارے میں یہ تصور کرنا کہ مجھے حق بات گراں گزرے گی اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری ذات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ اس لئے کہ جس شخص پر حق

بات گراں ہو یا وہ عدل پیش کئے جانے کو ناپسند کرتا ہو اس کے لئے حق اور عدل پر عمل کرنا تو کہیں زیادہ دشوار ہو گا۔ لہذا خبردار حرف حق کہنے میں تکلف نہ کرنا اور منصفانہ مشورہ دینے سے گریز نہ کرنا۔ اس لئے کہ میں ذاتی طور پر خود کو ارتکابِ خطا سے بالاتر نہیں سمجھتا۔»

(نہج البلاغہ - خطبہ ۲۱۴)

البتہ یہ بات واضح ہے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق امام علیؑ ہر قسم کی خطا، غلطی اور لغزش کے ارتکاب سے بالاتر ہیں۔ البتہ آپؑ اس کلام کے ذریعے امت کو اس بات پر ابھارتے ہیں کہ وہ آپؑ پر ناقدانہ نظر رکھے، تاکہ امت کا یہ طرز عمل بعد کو غیر معصوم حکمرانوں کے بارے میں بھی جاری رہے۔

اگر ہم امت کے سامنے اسلامی حکمراں کے کلی طرز عمل کی تصویر کشی کرنا چاہیں (چاہے یہ حکمران پیغمبر یا امامِ معصوم ہی کیوں نہ ہو) اور یہ بات واضح کرنا چاہیں کہ بنیادی مسائل جیسے صلح و جنگ اور بڑے بڑے سیاسی، اقتصادی اور دفاعی پروگراموں میں یہ طرز عمل کیا ہو گا تو اس کے لئے ہمیں خداوند عالم کے پیغمبر اسلامؐ سے یہ خطاب کو بطور سند سامنے رکھنا چاہئے جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ : وشاورھم فی الامر (اور معاملات کے بارے میں ان سے مشورہ کرو۔ سورۂ آل عمران ۳- آیت ۱۵۹)

یعنی خداوند عالم اسلامی قائد یا حکمران کو تلقین کرتا ہے کہ وہ امت سے مشورہ کرے، قطع نظر اس کے کہ مشورت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رائے کی اتباع اس پر واجب ہو یا یہ کہ شوریٰ معاشرتی حالات پر اثر انداز ہونے والا ایک موثر عامل شمار ہوتی ہو۔ اسی آیت کے آخر میں آیا ہے کہ : فاذا عزمت فتوکل علی اللہ (اور جب ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو)

اسلام میں حکومت و اقتدار سے مراد تھیوکریسی (Theocracy) نہیں کہ

جس کی بنیاد پر حاکم خدا کے نام پر اپنے ذاتی رجحان کے مطابق حکومت کرتا ہے' بلکہ اسلام کی نظر میں حاکم کا فریضہ خداوندِ حالم کی طرف سے قرار دی گئی حیثیت اور مقام کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت کرنا ہے۔ البتہ اسکی حکومت اللہ رب العزت کے وضع کردہ دستورِ عمل کے تحت ہوتی ہے اور اسے اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی کا اختیار نہیں ہوتا۔ فرمان الٰہی ہے :

«ولو تقول علینا بعض الاقاویل لا خذ نا منه بالیمین ثم لقطعنا الوتین۔»

«اور اگر یہ پیغمبر ہماری طرف سے کوئی بات گڑھ لیتا تو ہم اسکے ہاتھ کو پکڑ لیتے اور پھر اسکی گردن اڑا دیتے۔» (سورۂ حاقہ ۶۹- آیت ۴۴ تا ۴۶)

نیز ارشاد ہوتا ہے :

«ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک۔»

«اور یقیناً تمہاری طرف اور تم سے پہلے والوں کی طرف یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تم شرک کروگے تو تمہارے تمام اعمال برباد کردیئے جائیں گے۔»

(سورۂ زمر ۳۹- آیت ۶۵)

ان آیات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی حکمراں اسلام کے عطا کردہ دستورِ عمل سے ہٹ کر اپنے ذاتی پروگرام پر عمل کا اختیار نہیں رکھتا۔

حتیٰ ایک مقام پر یہ بھی ملتا ہے کہ جب ایک واقعہ دعوت و حکومت کے سلسلے میں پیغمبر کی استقامت میں رخنے کا موجب ہوا چاہتا ہے تو خداوند عالم دوٹوک اور واشگاف لہجے میں فرماتا ہے :

«وان کادوا لیفتنو نک عن الذی اوحینا الیکن لتفتری

علینا غیرہ واذالا تخذوک خلیلاولو لا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا اذا لا ذفناک ضعف الحیاۃ وضعف الممات ثم لا تجدلک علینا نصیرا۔»

«اور یہ ظالم اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ آپ کو ہماری وحی سے ہٹا کر دوسری باتوں کے افترا پر آمادہ کر دیں اور اس طرح یہ آپ کو اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہماری خاص توفیق نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ نہ کچھ مائل ضرور ہو جاتے اور پھر ہم زندگانی دنیا اور موت دونوں مرحلوں پر (عذاب کا) دہرا مزہ چکھاتے اور آپ ہمارے خلاف اپنا کوئی مددگار بھی نہ پاتے۔»

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۷۳ تا ۷۵)

اس طرح خداوند عالم حکومت اور دعوت کے تجربے کو باہم یکجا کرتا ہے تاکہ اس دباؤ کے مقابلے پر پیغمبر کی حمایت کرے جس نے انہیں چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے اور انہیں اس بات کی تلقین کرے کہ اہم مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ آپ کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں، آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں یا نہیں بلکہ اہم ترین بات یہ ہے کہ آپ کا فریضہ دیئے گئے دستور عمل کی نگہبانی اور حفاظت ہے، نیز خدا کی جانب کوئی ایسی بات منسوب نہ کریں جو آپ پر وحی نہیں کی گئی یا خدا کے ارادے اور چاہت کے برخلاف ہے۔

اب تک کی گفتگو سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ اسلام کی نظر میں حکومت کوئی انفرادی اور ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ امت اور معاشرے سے مربوط مسئلہ ہے اور ایک ایسے شخص کی ذمے داری کا مسئلہ ہے جو لوگوں پر اپنے انفرادی رجحان کے مطابق حکومت نہیں کرتا بلکہ اس کی حکومت کی اساس وہ دستور عمل ہوتا ہے جس پر وہ خود اور امت ایمان و اعتقاد رکھتی ہے۔ لہذا حاکم اس دستور عمل کے اجرا و نفاذ کا بھی امین ہے اور اس دستور عمل

کی بنیاد پر لوگوں کا امانتدار بھی ہے۔

ان مسائل کے پیش نظر ہم پر لازم ہے کہ اسلامی قائد کی شخصیت کی عظمت بیان کرنے کے دوران (چاہے یہ رہبر و قائد پیغمبر ہو 'امام ہو یا فقیہ ہو) اور رہبر کی شخصیت کے لئے استعمال کئے جانے والے اپنے الفاظ میں غور و وقت سے کام لیں اور رہبری کی حدود اور حیثیت کو مد نظر رکھیں۔ کیونکہ بعض الفاظ سے شخصیت کی ایسی عظمت مجسم ہوتی ہے جو اسلام کے حکومتی اصولوں سے موافق اور ہم آہنگ نہیں ہوتی اور اس بات کا موجب بنتی ہے کہ لوگ تصور کرنے لگتے ہیں کہ وہ پیغمبر 'امام یا فقیہ کے سامنے کسی ارادے و اختیار کے مالک نہیں۔ یعنی یہ کہ حاکم کسی معین دستورِ عمل 'آئین و اصول کا پابند نہیں بلکہ مکمل آزادی اور اختیار کا مالک ہے۔

ہم معتقد ہیں کہ پیغمبر یا امام مکمل کھلی ہوئی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور یہ حضرات اسلام اور مسلمانوں کے امین ہیں۔ البتہ درج ذیل دونوں باتیں ایک دوسرے سے فرق رکھتی ہیں- ایک یہ کہ حکومت کو ذاتی اور شخصی امر کے طور پر دیکھا جائے اور اسکے تمام مسائل کو فردی اور شخصی سمجھا جائے اور دوسرے یہ کہ حاکم کو ایک ایسا عنصر سمجھا جائے جو اسلامی اصولوں کے دائرے میں اپنی ذمے داری کی حدود سے قدم باہر نہیں نکالتا۔ کیونکہ حکومت کو شخصی سمجھنے کے نتیجے میں ایسے مفاہیم سامنے آتے ہیں جو اسلامی ماڈل سے موافقت نہیں رکھتے۔

معاشرہ اور حکومت

سوال : معاشرہ 'حکومت کے سلسلے میں اپنا کردار کس طرح ادا کر سکتا ہے ؟

جواب : اسلام کے نکتۂ نظر سے معاشرے کا کردار یہ ہے کہ وہ قائد اور رہبر کے اقتدار کی شرعی حیثیت کو قبول کرے اور اسکی طرف سے جو دستورِ عمل دیا جائے یا جس چیز کا پابند کیا جائے اسکی خلاف ورزی نہ کرے۔

«فلاوربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔»

«پس آپ کے پروردگار کی قسم یہ ہر گز صاحب ایمان نہ بن سکیں گے جب تک کہ آپ کو اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں اور پھر جب آپ فیصلہ کر دیں تو اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی اور ناراضگی محسوس نہ کریں اور آپ کے فیصلے کے سامنے سراپا تسلیم ہو جائیں۔» (سورۂ نساء ۴- آیت ۶۵)

نیز ارشاد ہے :

«وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرة من امرھم۔»

«اور کسی مومن مرد یا عورت کو حق نہیں ہے کہ جب خدا اور اسکا رسول کسی امر کے بارے میں فیصلہ کر دیں تب بھی وہ اپنے اس امر کے بارے میں صاحبِ اختیار رہیں۔» (سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۳۶)

ان آیات سے استفاضہ ہوتا ہے کہ شرعی حکومت کی اطاعت معاشرے پر فرض ہے۔ بایں ہمہ شرعی حکومت کی بھی یہ ذمے داری ہے کہ لوگوں پر اپنے دروازے کھلے رکھے' ان کی جانب سے کی جانے والی ہر تنقید و اعتراض بغور سنے اور ان سے استفادہ کرے۔ نیز ایسے مسائل جن کے بارے میں مختلف آراء پائے جانے کا امکان ہو' ان پر معاشرے سے گفتگو کا آغاز کرے۔ ہم آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں آنجناب کی جنگی تدابیر اختیار کرنے کے دوران اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں (بالخصوص جنگ بدر کے موقع پر) کہ آپؐ اپنے اصحاب سے مشورے کرتے ہیں اور جب مسلمان جنگ کا آغاز کرنے کی رائے دیتے ہیں تو آپؐ اسے قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ

بھی مختلف مسائل پر دوسروں سے گفت و شنید کرتے ہیں۔ حتیٰ اپنے ایسے مخالفین سے بھی گفتگو کرتے ہیں جن کے مخالفانہ اقدام جنگ پر منتہی ہوئے۔ جیسے جنگ جمل سے پہلے طلحہ و زبیر سے گفتگو، نیز ان لوگوں سے بات چیت جو خلافت میں آپؑ پر سبقت لینے کی کوشش کرتے ہیں اور خوارج، معاویہ اور اپنے گرد و پیش رہنے والے لوگوں سے مکالمہ۔

ہم (جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکے ہیں) معتقد ہیں کہ معاشرے کا حق قیادت پر یہ ہے کہ قائد و رہبر اس سے رائے طلب کرے اور کشادہ روئی کے ساتھ معاشرے کے مطالبات اور مسائل پر توجہ دے۔

سوال : کیا معاشرے کا کردار صرف مشورت تک محدود ہے یا معاشرہ پروگرام کی کلی تنظیم میں بھی حصہ دار ہو سکتا ہے ؟

جواب : پیغمبر یا امام کی حکومت کی صورت میں ان کے پروگرام میں تبدیلیاں لانے کے سلسلے میں معاشرے کا کردار صرف اس دائرے میں محدود ہوتا ہے جس کی پیغمبر یا امام کی طرف سے بنائے گئے اصول اجازت دیتے ہیں۔

البتہ اگر قائد و رہبر، پیغمبر یا امام نہ ہو، تو اس پر لازم ہے کہ مسائل کے سلسلے میں ماہرین کے توسط سے معاشرے سے رجوع کرے۔ کیونکہ بہت سے ایسے موضوعات ہیں جن میں اجتماعی بصیرت اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ایسے مسائل بھی ہوتے ہیں جن سے ماہرین کی ایک خاص ٹیم ہی عہدہ بر آ ہو سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ پروگرام کی شرعی حیثیت معاشرے کی عطا کردہ نہیں۔ قیادت و حکومت سے تعلق رکھنے والے بعض نظریات اقتدار کے قانونی جواز کے لئے عوام کی حمایت پر تاکید کرتے ہیں۔ جیسا کہ شورائی نظریئے کی بنیاد پر سربراہ مملکت کو شورا کے ذریعے قانونی جواز حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سے سیاسی اور اقتصادی نظاموں کے قیام کے لئے رائے عامہ کا اظہار

ضرورت ہے۔ اور وہ رائے عامہ کی تائید سے اپنا جواز پاتے ہیں۔

نظریۂ ولایت فقیہ میں معاملات و امور کو قانونی جواز فقیہ اور اسکی رائے سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ فقیہ اپنی رائے میں استبداد سے کام نہیں لے سکتا' چارو ناچار اسکے لئے معاشرے سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ اور وہ امور جو اجتماعی مہارت کا تقاضا کرتے ہیں وہاں اسے لوگوں سے مشورت کرنا چاہئے۔ (البتہ) نظریۂ ولایت فقیہ اس چیز کو واجب قرار نہیں دیتا لیکن اس نظریے کے اجراء کی حقیقی شرائط اکثر مواقع پر عوام الناس کی رائے لینے کو قرین مصلحت قرار دیتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے جمہوری اسلامی ایران میں امام خمینیؒ نے اپنایا۔ امام خمینیؒ نے ولایت فقیہ کو عوامی رائے سے جدا اور علیحدہ ایک نظریے کے عنوان سے نہ پیش کیا اور نہ اس پر عمل کیا۔

ہم نے دیکھا کہ امام خمینیؒ نے تمام (اہم) معاملات میں حتیٰ ان امور میں بھی جن میں نظری اعتبار سے رائے طلب کرنے کی گنجائش نہیں (جیسے مملکت کا آئین جو دینِ اسلام کا مظہر ہے) لوگوں سے رائے طلب کی۔

نظری (Theoretically) لحاظ سے اسلام یا ایسے اسلامی اصول جن کا جواز مصادرِ شریعت سے ثابت شدہ ہے' لوگوں سے ان کی قبولیت یا عدم قبولیت کے بارے میں رائے طلب کرنے کا کوئی مفہوم ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود امام خمینیؒ نے استصواب رائے کی راہ اختیار کی اور اس میں آپ کے پیش نظر یہ بنیادی بات تھی کہ فقیہ کا حاکمِ مطلق کے مقام کا حامل ہونا (نظری لحاظ سے) کہیں مستقبل میں حکومت کے انحراف پر منتج نہ ہو۔ کیونکہ بسا اوقات ایک حاکم کو ایسے شرائط و حالات پیش آجاتے ہیں جو اسے ایسے طاقتور مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں کوئی اور اس کا سامنا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یا حاکم اس طرح راہ راست سے بھٹک جاتا ہے کہ کوئی اسکے سامنے علم بلند کرنے کی طاقت نہیں

رکھتا۔ اور یہ حقیقی امکان موجود ہوتا ہے کہ انحراف کی صورت میں حاکم اجتماعی پروگراموں کو اپنے ذاتی مفادات کے زیر کنٹرول لے آئے۔

لہذا یہ تجربہ (اسلامی جمہوریہ ایران) جس میں نظریۂ ولایت فقیہ اور نظریۂ شوریٰ کو یکجا کیا گیا ہے ممکن ہے حکومت اسلامی کی بہت سی امکانی خطاؤں میں کمی کا موجب ہو۔

اس مقام پر شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ نظریۂ ولایت فقیہ میں، فقیہ کے لئے فقہی اجتہاد اور اپنے زمانے کے مسائل سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ عدالت بھی شرط ہے۔ لہذا فقیہ عدالت سے محروم ہو جانے کی صورت میں اپنا شرعی جواز بھی کھو بیٹھے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے اگر وہ فقہی اجتہاد کے عنصر سے محروم ہو جائے تو اسکا شرعی جواز جاتا رہے گا۔ لہذا اس لحاظ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہئے۔

اس پر ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ بات نظری لحاظ سے تو درست ہے لیکن واقعیت اور حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔ کیونکہ منحرف فقیہ اپنے انحراف کا اعتراف تو کرنے سے رہا۔ نیز اسکے حاشیہ نشین اور حواری بھی اسکے انحراف کی توجیہ کریں گے۔ لیکن اگر حکومت کا مسئلہ قوم کی تائید سے جڑا ہوا ہو تو قوم کے مخالف ہو جانے کی صورت میں منحرف حاکم کا اپنی حکومت قائم و دائم رکھنا سخت مشکل ہے۔

اسی بنا پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسا نظریہ جس میں حقائق کو ملحوظ رکھا گیا ہو امت کو حاکم کی اصلاح کے لئے تحریک چلانے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

فقیہ اور معاشرہ

سوال : فقیہ اور معاشرے کے درمیان رابطے کے بارے میں آپ کا نکتۂ نظر کیا ہے ؟

جواب : ہمارے خیال میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ فقیہ معاشرے کے سامنے کھلا رویہ رکھے۔ تمام مسائل میں معاشرے سے رابطے میں رہے۔ کیونکہ یہ بات معاملات کے شخصی اور ذاتی ہونے کی روک تھام کرتی ہے اور فقیہ کو لغزش کا شکار ہونے سے باز رکھتی

ہے' اسی طرح معاشرہ فقیہ کے اشتراک سے جو فیصلہ کرتا ہے اس کی ذمے داری معاشرے کے کاندھے پر ڈالتی ہے۔ یعنی معاشرے کو یہ احساس بخشتی ہے کہ وہ بھی فیصلوں میں شریک ہے' ہر چند یہ فیصلہ معاشرے کی طرف سے صادر نہ ہوا ہو' اور اسکی صورت یہ ہو کہ فقیہ معاشرے سے مشورت کے بعد یا تو خود کسی دوسری رائے کا انتخاب کرے یا معاشرے کی دی ہوئی رائے کو قبول کرے۔

ہمارے خیال میں پیغمبر اسلامؐ اور حضرت علیؑ کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ نیز بہت سی نصوص اسکی تلقین کرتی ہیں۔ لہذا اسلام میں حکومت کا نظریہ تفوق اور برتری کی کوشش کا نام نہیں۔ بلکہ حقیقت پسندانہ اور پیغمبر اسلامؐ اور امام علیؑ کی حکمرانی کے اسلوب سے برآمد ہونے والا اور مصادر شرعی کے مطابق نظریہ ہے۔

اس گفتگو سے یہ مراد نہ لی جائے کہ ہم جمہوریت کو حکومت کے قانونی جواز کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جمہوریت کو حکومتی معاملات چلانے کے لئے ایک وسیلے کے عنوان سے بروئے کار لانے اور اسے حکومت کے قانونی جواز کی بنیاد شمار کرنے کے درمیان فرق ہے۔

ہم جمہوری طرز عمل کے جواز کے بارے میں (جمہوریت کی ماہیت اور خاصیت کے لحاظ سے) جبکہ وہ کسی مسلم الثبوت شرعی حکم کے مخالف نہ ہو کوئی نزاع و اختلاف نہیں رکھتے لیکن لوگوں کی رائے ہی کو کسی بات کے جواز کی بنیاد بنا لینے کے بارے میں ہمیں اعتراض ہے۔ کیونکہ ہم رائے عامہ کو شرعی جواز کی بنیاد نہیں سمجھتے۔ لہذا اگر فرض کریں کہ عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے غیر مسلم یا غیر سنجیدہ مسلمان شخص کو حاکم چن لیں جبکہ جمہوری فیصلہ حکومت کے قانونی جواز کی بنیاد ہو تو پھر جامع الشرائط حاکم کی حکومت کا قانونی جواز نہ رہے گا جبکہ ہم اسلام کی حقانیت کے اس کے دین خدا ہونے کی بجائے اس بنیاد پر قائل نہیں ہو سکتے کہ اسے لوگوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔

لہذا ہم جمہوریت کے (مثبت) نتائج سے قطع نظر اسکے ہمراہ موجود دوسرے فکری لوازمات کی بنا پر اسکے بارے میں احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

نظریہ اور زمینی حقائق

سوال : خارجی حقائق کے ساتھ اس نظریے کی سازگاری کا کیا امکان ہے ؟

جواب : میرے خیال میں اسلامی جمہوریہ ایران کا تجربہ (اس میں واقع ہونے والے معمولی مسائل سے چشم پوشی کرتے ہوئے) کلی طور پر بہترین تجربوں میں سے ہے۔ یہ تجربہ جس میں نظریہ ولایتِ فقیہ اور نظریۂ شوریٰ کو یکجا کر دیا گیا ہے اسلامی مفاہیم کے لحاظ سے حقیقت پسندانہ ترین نظریات میں سے ہے۔

البتہ ایک نظریہ اور بھی ہے جس کی جانب شہید سید محمد باقر الصدرؒ نے ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اپنے آخری آثار میں سے ایک اثر میں اشارہ کیا ہے۔ اس نظریے کی بنیاد پر حکومت کے معاملے میں قوم کا بھی بڑا کردار ہے اور فقیہ کا بھی۔ البتہ فقیہ کو صدر مملکت نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسکا کردار حکومت کی نظارت اور نگرانی ہو جبکہ قوم (اگر آزادی کی حامل ہو) حکومت کے بارے میں اپنے دوش پر بڑی ذمے داری رکھتی ہے۔

شہید صدرؒ نے اس وقت یہ نظریہ اختصار کے ساتھ پیش کیا تھا اور اسکے بارے میں تحقیقی اور تجزیاتی کام نہ کر سکے تھے۔ یہ نظریہ گہری تحقیق کا متقاضی ہے۔

اگر ہم حکومت اسلامی کے نظریے کو خلاصے کے طور پر یہاں بیان کریں تو ہمیں کہنا چاہئے کہ حکومت اسلامی (حتیٰ اگر اس حکومت کے سربراہ پیغمبر یا امام ہوں جو امت پر ولایتِ مطلقہ کے حامل ہیں) مغرب کے بیان کردہ مفہوم میں تھیوکریسی نہیں ہے۔ اسلامی حکومت میں جس ولایت پر عمل کیا جاتا ہے وہ شخصی ولایت نہیں ہے بلکہ ایک انسٹیٹیوشنل ولایت ہے جس سے ایک وضع شدہ دستورِ عمل کے مطابق کام لیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ آپؐ لوگوں کو بتادیں کہ آپؐ اولین مسلمان ہیں اور ظاہر ہے اولین مسلمان دوسروں سے زیادہ اسلام میں ڈھلا ہوا ہوگا۔

البتہ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر کا اپنا کوئی خاص فریضہ ہوتا ہے اور اسی طرح امام بھی خاص فریضے کا حامل ہوتا ہے۔ ہم اس فکر کو قبول نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر ہماری سوچ یہ ہو تو ہم اپنے عمل کا شرعی جواز ثابت کرنے کے لئے پیغمبر یا امام کے طرز عمل کو بطور سند پیش نہیں کر سکتے۔

بعض لوگ یہ تصور رکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کا انقلاب امام کے لئے مخصوص تھا اور ہم اس سے ماڈل کے طور پر استفادہ نہیں کر سکتے اور ظالم حکومتوں کے خلاف جدوجہد میں اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امر اسرارِ امامت میں سے ایک امر ہے اور اگر ہم شرعی حدود میں رہتے ہوئے عمل کرنا چاہیں تو ہمیں پتا چل جائے گا کہ یہ عمل شرعی پیمانوں سے ناموافق ہے۔ کیونکہ یہ عمل اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے اور خود کو خطرات میں جھونکنے کے مترادف ہے۔

اسی دلیل کی بنیاد پر بعض لوگ فقہا کے اس فرمان کو قبول نہیں کرتے کہ ہمیں (پیغمبر اور امام) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے اعمال انجام دینے چاہئیں ایسے ہی لوگ پیغمبر اسلامؐ کے اعمال اور مسائل کو دیکھ کر آنحضرتؐ کے اعمال اور اقدامات کو آنحضور کی شخصیت میں چھپے ہوئے اسرار میں سے سمجھتے ہیں جو عام لوگوں کے لئے ناقابلِ فہم ہیں۔

لیکن (ان لوگوں کے اس دعوے کے برخلاف) ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم قرآن مجید میں پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کو شرعی جواز کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ :لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (تمہارے لئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۲۱) اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ امامت ہرچند کہ نبوت نہیں لیکن کارِ نبوت کا استمرار ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ پیغمبر اور امام، معصوم ہونے کے باوجود ایک ماڈل اور اپنے بعد آنے والے مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہیں جن پر ان ہستیوں کے اعمال ور فتار کی پیروی لازم ہے۔ کیونکہ پیغمبر اور امام اپنے عمل کے ذریعے اسلام کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

تہذیبوں کے درمیان مکالمہ

یہ انٹرویو حوزۂ علمیہ قم المقدس، ایران سے چھپنے والے مجلّے ((نامۂ مفید)) سے لیا گیا۔

تہذیبوں کے درمیان مکالمہ

سوال : گفتگو (Dialogue) کے بارے میں آپ کا نکتۂ نظر کیا ہے اور قرآن کریم اس بارے میں کیا اصول دیتا ہے ؟

جواب : ہم نے ہمیشہ کہا ہے اور اب بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ دین میں ابتداء ہی سے گفتگو اور افہام و تفہیم کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جب ابلیس نے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو خداوند عالم نے اس سے بات چیت کی، اس کی بات سنی اور اسے جواب دیا۔ اسکے بعد جب ابلیس نے خدا سے مہلت طلب کی تو اللہ نے اسکی یہ درخواست قبول کی اور اسے مہلت دی اور اس پر واضح کیا کہ وہ لوگوں پر مطلق اثرانداز نہیں ہو سکے گا : ان عبادی لیس لک علیھم سلطان الامن اتبعک من الغاوین (میرے بندوں پر تیرا کوئی اختیار نہیں ہے سوائے ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کرنے لگیں۔ سورۂ حجر ۱۵- آیت ۴۲)

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب خداوند عالم نے آدمؑ کو خلق کرنا چاہا تو فرشتوں سے بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ : انی جاعل فی الارض خلیفہ (میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ سورۂ بقرہ ۲- آیت ۳۰) اسکے بعد فرشتوں نے خدا سے سوال کیا

اور خدا نے ان کو جواب دیا۔ پھر خدا نے آدمؑ سے کہا کہ وہ فرشتوں سے گفتگو کریں۔ اسکے بعد بہشت میں آدمؑ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اسکے بارے میں بھی خدا اور شیطان کے درمیان گفتگو جاری رہی۔

علاوہ ازیں ہم سب اس بات سے بھی واقف ہیں کہ (قرآن کریم کی روایت کے مطابق) خدا نے بہت سے انبیاء کے ساتھ بھی گفت وشنید کی ہے۔

بنابر ایں گفتگو اور مکالمہ ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جس کی طرف خدا بھی متوجہ کرتا ہے۔ خداوند عالم نے اپنے انبیاءؑ کو گفتگو کی ہدایت کی تاکہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں سے ایمان، کفر، توحید، شرک اور دوسرے عقیدتی موضوعات پر گفتگو کریں، ان کے اعتراض سنیں اور ان اعتراضات کے جواب دیں۔

بنابر ایں ہماری نظر میں گفت و شنید دعوت اور تبلیغ کا قرآنی اسلوب ہے، اس اسلوب کو خداوند عالم نے جدال کا نام دیا ہے: وجادلهم بالتی هی احسن (اور اہل کتاب سے بہترین طریقے سے بحث کیجئے۔ سورۂ نحل ۱۶- آیت ۱۲۵) ولا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی هی احسن (اور اہل کتاب سے مباحثہ کرو مگر اس انداز سے جو بہترین انداز ہے۔ سورۂ عنکبوت ۲۹- آیت ۴۶)

اس بارے میں قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر گفتگو کی گئی ہے اور ہم نے اپنی تالیفات مثلاً «الحوار فی القرآن» اور «اسلوب الدعوة فی القرآن» میں اس بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔

گفتگو اور باہمی بحث مباحثہ ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے دوسروں تک اپنے افکار و خیالات پہنچائے جا سکتے ہیں اور ان کی آراء و نظریات سے آگاہ ہوا جا سکتا ہے تاکہ تفاہم باہمی پیدا ہو اور دوسروں کو اپنی فکر قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

ہم جب خود آپ سے آپ غور و فکر کرتے ہیں تو وہ بے صدا ہوتا ہے' ہمارا یہ مباحثہ دوسرے نہیں سن پاتے۔ اسکے بر خلاف جب ہم دوسروں کے سامنے مباحثہ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر غور و فکر کرتے ہیں تو یہ باہمی غور و فکر سنائی دینے والا ہوتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ افکار کا تبادلہ کریں' مل بیٹھ کر سوچ چار کریں کیونکہ مسلسل اجتماعی غور و فکر ہمیں بہت سے فکری اور تمدنی موضوعات میں مطلوبہ نتائج تک پہنچا دیتا ہے اور گفتگو اور باہمی مکالمے کا اسلوب نتائج کے حصول کا مختصر ترین راستہ ہے جسے اسلام نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

سوال :: آپ نے ایک جگہ کہا ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم مستقبل میں اور شدید ہو جائے گا۔ کیا اسکا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ تہذیبوں کے درمیان گفتگو اور مکالمے پر یقین نہیں رکھتے ؟

جواب : ہمارے خیال میں مغرب پر حاکم حکومتوں نے ہمارے لئے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ اپنے تبلیغاتی ذرائع سے مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کر کے اہل مغرب کے اذہان کو اپنے زیر اثر کر لیا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مخاصمانہ رویہ اپنایا ہوا ہے' ان کا مقصد خود مسلمانوں میں اسلام کو ختم کرنا یا بعض اسلامی عناوین کو اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول اور مسلمانوں پر تسلط کے لئے استعمال کرنا ہے۔ کلی طور پر مغرب اسلام سے مکالمے اور گفتگو کے لئے کوشاں نہیں۔ کیونکہ اس کے سامنے اہم بات یہ نہیں کہ حقیقت کیا ہے ؟ وہ یہ نہیں جاننا چاہتا کہ حقیقت اسلام کے پاس ہے یا غیر اسلام کے پاس ؟ بلکہ مغرب کا مسئلہ محض اور محض اپنے مفادات کا حصول ہے۔ مغرب تمام وسائل اور ذرائع استعمال کر کے عالم اسلام سے اپنے مفادات پورے کرنا چاہتا ہے۔ بنابر ایں جب تک مغرب میں یہ ذہنیت کار فرما ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جب تک

اس روش کو اختیار کئے ہوئے ہے اس وقت تک تہذیبوں کے درمیان گفتگو اور مکالمہ مشکل نظر آتا ہے۔

ہم مغرب سے گفتگو کو مسترد نہیں کرتے' ہم اب بھی اس مغرب سے گفتگو کا پرچار کرتے ہیں جو فکری اور تمدنی گفتگو کے قواعد اور آداب کو مانتا ہو اور مغرب کے ایسے لوگوں سے گفت و شنید کو مفید سمجھتے ہیں جو وہاں کئے جانے والے پروپیگنڈے کے زیر اثر نہ ہوں۔ ہم ان سے گفتگو پر بہت اصرار کرتے ہیں کیونکہ گفتگو ہی کے ذریعے اہل مغرب کی عقلوں اور افکار کو کھولا جا سکتا ہے اور ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مغربی معاشروں میں اسلام کا تعارف کرا سکتے ہیں اور انہیں اسلام کی طرف بلا سکتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اہلِ مغرب سے فکری اور سیاسی مسائل پر سنجیدہ اور بلا تعصب مکالمہ وہاں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بحث کا آغاز کرنے کا بہترین موقع ثابت ہو سکتا ہے۔

ہم اہلِ مشرق کے لئے دو چیزیں تکلیف دہ ہیں' ایک تعصب اور دوسرے متاثر ہونا جو دوسروں کی بات قبول کرنے کی آمادگی کو (حتیٰ گفتگو کی سطح پر بھی) ختم کر دیتا ہے۔

بنابرایں میرا خیال ہے کہ گہری علمی ذہنیت کے ساتھ اور ایسے مغربی انسان کی عقلانی ذہنیت سے قریب ہو کر جس کے دل میں سابقہ تاریخ کے حوالے سے کوئی کینہ نہ ہو گفتگو کے میدان میں آنا اہل مغرب کو اسلام سے آشنا کرنے اور انہیں اسلام کا گرویدہ بنا لینے کا ایک مناسب موقع ہو گا۔

سوال : ہم دیکھتے ہیں کہ ہر گروہ اپنے عقیدے پر مطمئن ہے :کل حزب بما لدیھم فرحون (اور ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر خوش اور مگن ہے۔ سورۂ مومنون ۲۳ - آیت ۵۳) اور ہر تہذیب اپنے سرمائے پر نازاں اور اسکے بارے میں متعصب ہے۔ ایسی صورت میں گفتگو کس طرح کی جا سکتی ہے ؟

جواب : ہمارے خیال میں گفتگو کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے۔ ایسا انسان جو صاحب فکر و شعور اور کسی نفسیاتی الجھن (Complex) کا شکار نہ ہو وہ اپنے مخصوص دائرہ فکر سے دوسرے دائرہ فکر میں منتقل ہو سکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے بعض ممتاز دانشور (جیسے فرانس کا روژہ گارودی) اسلام کے بارے میں مغرب کے پھیلائے ہوئے غلط تصور کو خاطر میں لائے بغیر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ ایسے نمونوں کو ہم اہل مغرب کی طرف سے اسلام قبول کرنے کے حقیقی امکان کی ایک مثال سمجھ سکتے ہیں۔

پس یقیناً یہ امکان موجود ہے کہ ایک مغربی انسان اپنے مارکسی یا مسیحی عقیدے سے دستبردار ہو کر اسلام قبول کر لے۔ پس اپنے گروہ سے لگاؤ میں اگر تعصب شامل نہ ہو تو یہ کوئی مشکل نہیں۔ گروہ پرستی اس وقت مشکل کھڑی کر دیتی ہے جب وہ افراد کو اپنے گروہ میں مقید کرنے کا موجب ہو، کسی کی بات سننے پر تیار نہ ہونے دے اور آزادانہ غور و فکر کی اجازت نہ دے۔ جیسے کہ بہت سے لوگ خود کو اپنی تہذیب و ثقافت میں محدود کر لیتے ہیں اور دوسروں کی کسی چیز کو سننے یا پڑھنے پر تیار نہیں ہوتے۔

سوال : کیا تہذیبوں کے درمیان گفتگو میں عالم اسلام کے پاس قوی عناصر موجود ہیں۔ اگر ہیں تو وہ عناصر کیا ہیں ؟

جواب : ہمارا قوی اور طاقتور عنصر «فکرِ اسلامی» ہے۔ البتہ اس فکر کے لئے ایسے مفکرین ضروری ہیں جو دوسروں کے سامنے اسلام پیش کرتے ہوئے ان قوی عناصر سے استفادہ کرنا جانتے ہوں۔

اس سلسلے میں عالم اسلام کو جو مشکل درپیش ہے وہ یہ ہے کہ علمائے اسلام اور دانشوروں کی سرگرمیاں ان علاقائی ضروریات سے متاثر ہیں جن علاقوں میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ عالمی تناظر میں اسلام کے بارے میں نہیں سوچتے اور اس پہلو سے

غور و فکر نہیں کرتے کہ اسلام کا پیغام عالمگیر ہے اور دنیا کو اسلام کی ضرورت ہے۔ جبکہ قرآن کریم اپنے رسول کو کافہ للناس (تمام لوگوں کیلئے) اور عالمین کے واسطے رحمت کے طور پر پکارتا ہے۔

بنابرایں ہمارے خیال میں اس بات کی ضرورت ہے کہ گہرا غور و فکر کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اسلام عصر حاضر اور آج کے انسان کی ضروریات اور تقاضوں کا کیا حل پیش کرتا ہے اور پیچیدہ مشکلات اور مسائل کے بارے میں کیا پروگرام رکھتا ہے۔

جب ہم اسلام کو ایک عالمی دین کے طور پر پیش کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور ایک ایسے دین کی صورت میں سامنے لا سکیں گے جو عالمی سطح پر تمام مسائل کے حل پر قادر ہے تو اسلام کے دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں قوی اور طاقتور ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

سوال : کیا آپ آج کے عالمِ اسلام میں کسی متعین تمدن سے واقف ہیں؟

جواب : جب ہم اس نکتۂ نظر سے عالمِ اسلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ایک مبہم تمدن کا مشاہدہ کرتے ہیں جو نہ اسلامی تمدن ہے اور نہ بدوی اور نہ ہی مغربی فیھا من کل فاکھه زوجان۔

سوال : ہم اس حال کو کیوں پہنچے اور مغرب علم و دانش اور ٹیکنالوجی کی بلندیوں اور سماجی ترقی میں اس قدر آگے کیسے نکل گیا؟

جواب : آپ کے اس سوال نے مجھے نجف اشرف کے دو دوستوں کے درمیان ہونے والی ایک گفتگو یاد دلا دی۔ ان میں سے ایک دوست مرجعیت کے بلند مقام پر پہنچ چکا تھا جبکہ دوسرا دوست ایک عام عالمِ دین ہی بن پایا تھا۔ پیچھے رہ جانے والے دوست نے اپنے مرجع دوست سے سوال کیا کہ ہم نے حصولِ علم کا ایک ساتھ آغاز کیا' ایک ہی حلقۂ درس ہم دونوں کا تھا اسکے باوجود آپ نے کس طرح یہ مقام حاصل کر لیا اور میں اتنا پیچھے رہا؟ ان

مرجع نے جواب دیا : اے شیخ ! ہم دونوں نے سفر شروع کیا' میں نے روشنی میں راستہ بنایا اور تم وہیں کھڑے کے کھڑے رہے۔

سوال : آپ کے خیال میں اس پسماندگی اور بد حالی سے نجات کی راہ کیا ہے ؟

جواب : راہ یہ ہے کہ جس راستے پر دوسرے چلے ہیں ہم بھی وہی طے کریں۔ ہمیں اسلامی تاریخ سے بہت سے سبق لینے چاہئیں۔ اسلام نے سو سال سے بھی کم عرصے میں ایک نیا تمدن ایجاد کیا' ہم اسی تمدن کو آج بھی ظاہر کر سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے علمی اور تحقیقی مراکز میں بہت سے مسلمان مصروفِ کار ہیں جن کا سائنسی انکشافات اور ایجادات میں ہاتھ ہے۔ ان میں سے بہت سے مغربی سائنسدانوں کے ہم پلہ ہیں بلکہ بعض حالات میں ان سے بہتر ثابت ہوئے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ مسلمان ترقی کی جانب سفر کے لئے گرانقدر صلاحیتوں اور قوتوں کے مالک ہیں بشرطیکہ اسلامی ممالک میں علمی سرگرمیوں کے لئے مناسب مواقع فراہم کئے جائیں۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی حکومتیں اور وہاں کا حاکم طبقہ ذہانتوں کو فرار پر مجبور کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ اذہان ان مغربی ممالک میں جا پہنچتے ہیں جو انہیں گرم جوشی کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں' انہیں خریدتے ہیں اور اپنے علمی اور تحقیقی مراکز میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

اسکے بر خلاف ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان حکومتوں کی طرف سے جہلا (اور بے مصرف لوگوں) کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی جاتی ہے لیکن صاحبانِ علم اور موجدین کو مناسب مواقع فراہم نہیں کئے جاتے۔

سوال : آپ کی نظر میں اسلام کی کامیابی کا راستہ کیا ہے۔ کیا اسلام کی کامیابی طاقت کی منطق سے وابستہ ہے یا منطق کی طاقت ہے ؟

جواب : ہمارے خیال میں دونوں باتیں ضروری ہیں۔ ہمیں منطق کی طاقت سے بھی لیس

ہونا چاہئے تاکہ دوسروں کی منطق کا مقابلہ کر سکیں۔ کیونکہ دوسرے بھی علمی اور فکری لحاظ سے ایک منطق کے مالک ہیں۔ ہمیں اپنی طاقتور منطق سے ان کی منطق کا مقابلہ کرنا ہو گا۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اغیار سیاسی، عسکری اور اقتصادی قوت کے مالک ہیں اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم بھی طاقت کی منطق سے استفادہ کریں جیسا کہ اس آیۂ کریمہ میں ہمیں حکم دیا گیا ہے: وعدو الھم ما استطعتم من قوۃ (اور تم سب ان کے مقابلے کے لئے امکانی قوت کا انتظام کرو۔ سورۂ انفال ۸ - آیت ۶۰) کیونکہ دوسروں کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے قوت ہی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ ممکن ہے دوسرے اپنی طاقت سے فائدہ اٹھا کر ہم پر تسلط کے حصول کا ارادہ رکھتے ہوں۔

بنابر ایں ہم منطق کے طاقت کی بھی حمایت کرتے ہیں اور طاقت کی منطق کے بھی قائل ہیں۔ البتہ اس اصول کی روشنی میں جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے یعنی کسی کے حق کو پامال نہ کیا جائے بلکہ صرف اسلام اور مسلمین کا تحفظ پیشِ نظر ہو۔

سوال: آپ کے خیال میں تہذیبوں کے مابین مکالمے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں؟

جواب: تہذیبوں کے مابین گفتگو کی اہمیت اور افادیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے تہذیبوں کے پیروکار ایک دوسرے کو سمجھیں گے کیونکہ تہذیبوں کی ایک دوسرے سے دوری اور ان کے مابین عداوت اور باہمی روابط و تعلقات کا نہ ہونا تہذیبوں کے ماننے والوں کو ایک دوسرے سے آگاہ نہیں ہونے دیتا۔

بنابر ایں تہذیبوں کے درمیان گفتگو کے لئے اگر طبیعی طور پر حالات سازگار بنائے جائیں اور میدان ہموار کیا جائے تو اس طرح تفاہم باہمی کی فضا پیدا ہو گی اور یہ امر بعد کے مرحلے میں مشترکہ نکات تک پہنچنے اور ان کی بنیاد پر باہمی تعلقات برقرار کرنے کا امکان پیدا کر دے گا۔ یہ وہی چیز ہے جسے قرآن کریم کلمہ سواء (مشترک بات) کہتا ہے۔

اس راستے سے اختلافی مسائل پر گفتگو کا آغاز ہو گا اور قدرتی بات ہے کہ باہمی عداوت اور چپقلش سے دور رہتے ہوئے مشترکہ نکات پر گہری علمی گفتگو ان نکات پر مفاہمت پر منتج ہو گی۔

ضروری نہیں کہ ایک تہذیب کے تعلقات دوسری تہذیب سے ہمیشہ نزاع و چپقلش ہی کی حالت میں رہیں اور اس بنیاد پر وہ ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے رہیں بلکہ مشترکہ نکات کی اساس پر بہتر حالات کی دستیابی کے لئے باہمی گفت و شنید کی بنیاد پر بھی تعلقات استوار کئے جاسکتے ہیں۔ اس ذریعے سے وحدت اور عالمی صلح کے قیام کے لئے مناسب مواقع میسر آسکتے ہیں۔

تہذیبوں کے مابین گفتگو کے بکثرت مفید نتائج ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر تہذیب دوسری تہذیب سے وہ چیزیں اخذ کر سکے گی جو اس کے فکری اصولوں سے موافق ہوں۔

سوال : بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کے مقابلے میں عالم اسلام کی پسماندگی کا ایک سبب یہ ہے کہ عالمِ اسلام میں افکار و نظریات اور فہمِ اسلام کا اختلاف پایا جاتا ہے' یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں ؟

جواب : ہمارے خیال میں اس پسماندگی کا سبب فہمِ اسلام میں اجتہاد کا اختلاف نہیں۔ بلکہ اس کا سبب تعصب ہے' فکری تعصب ہے جو انسان پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ دوسرے کے فہم کا انکار کرنے لگتا ہے' اپنے آپ کو حقیقتِ مطلق کا مالک سمجھنے لگتا ہے اور دوسروں کی کسی بات کی ذرّہ برابر حقیقت کا قائل نہیں ہوتا۔

تعصب یہ ہے کہ انسان فریقِ مخالف کے افکار و خیالات کے مبانی اور ماہیت کو سمجھنے کے لئے گفتگو سے انکار کر دے۔ یہ تعصب آج بھی بعض ایسے علماء میں نظر آتا ہے جو روشن فکر نہیں اور دوسروں سے گفتگو' ان کی بات سمجھنے اور مقابل فریق کو حیثیت دینے

کے بارے میں شرحِ صدر کے مالک نہیں۔ یہ لوگ اجتہادی مسائل کا سامنا یا تو مطلق منفی یا مطلق مثبت ذہنیت کے ساتھ کرتے ہیں۔

بنابرایں آراء و نظریات کے اختلاف نہیں بلکہ تعصب ہے جس نے اسلامی معاشروں کو زوال سے دوچار کیا ہے۔ کیونکہ کسی معاشرے میں آراء وافکار کی کثرت اور اختلاف معاشرے کی بنیادوں کو منہدم نہیں کر سکتے۔ مختلف آراء و نظریات کا اظہار تو معاشرے کی ترقی اور وہاں فکری سرمائے کی فراوانی کا سبب ہوتا ہے۔

پھر اجتہادی اختلافِ رائے صرف اسلامی معاشروں ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ یہ مغرب میں بھی موجود رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں بھی بعض مفکرین شہنشاہیت کو ماڈل قرار دیتے ہیں اور اسے عدل وانصاف کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے مفکرین جمہوریت کو عدالت کے قیام کا فطری ذریعہ کہتے ہیں، کچھ عرصے پہلے تک بعض لوگ آمریت کو بہترین طرز حکومت سمجھتے تھے اور بعض دوسروں کے خیال میں جمہوریت ہی حکومت کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس مسئلے پر مغرب میں مسلسل نزاع رہا ہے اور طویل عرصے تک بحث ومباحثہ ہوا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خود مغرب ہی ہے جس نے اقتصادی میدان میں سوشلزم اور کیپٹل ازم کو متعارف کرایا ہے۔

لہذا ہم کہتے ہیں کہ اجتہاد کا اختلاف مشکل کا سبب نہیں بلکہ مشکل پیدا کرنے والی چیز تعصب اور جمود ہے۔ کیونکہ اہل مغرب طرزِ حکومت، اقتصادی مکاتب اور انسانی حقوق کے بارے میں تمام تر اختلافِ رائے کے باوجود ایسے مضبوط نظاموں کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن میں مختلف افکار و آراء کا احترام کیا جاتا ہے اور وہاں سیاسی، اقتصادی اور مذہبی اختلاف نظر کوئی خطرہ نہیں رکھتا۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ہر قسم کے فقہی، سیاسی، فلسفی اور کلامی اختلاف سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے ایسا ماحول

پیدا ہی نہیں کیا جس میں اطمینان کے ساتھ مختلف فکری نکتہ ہائے نظر کو پیش کیا جا سکے۔ کیونکہ اب بھی اسلامی معاشروں کے سربر آوردہ افراد کے ذہنوں پر شخصیت پرستی حاوی ہے' یہاں تک کہ وہ دوسروں کو مخالف آراء پیش کرنے تک کی اجازت نہیں دیتے۔

ہمیں قرآنی طرزِ عمل کی پیروی کرنی چاہئے جو دشمنان اسلام سے بھی انتہائی گہرے اور ظریف اسلوب اور نہایت عاقلانہ طریقے سے گفتگو کرتا ہے : هاتوابرها نكم ان كنتم صادقين (اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل لے آؤ۔ سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۱۱) وانا اواياكم لعلى هدى اوفى ضلال مبين (ہم یا تم یا تو ہدایت پر ہیں یا کھلی ہوئی گمراہی میں۔ سورۂ سبا ۳۴- آیت ۲۴) ها نتم هولا ء حاججتم فيما لكم به علم فلم تحاجون فيما ليس لكم به علم (اب تک تم نے ان باتوں میں بحث کی ہے جن کا کچھ علم تھا تو اب اس بات میں کیوں بحث کرتے ہو جس کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران ۳- آیت ۶۶)

مغرب نے اپنی زندگی کے بعض اطوار میں اسلامی قدروں کو اپنایا۔ اور ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم ان امور میں کافروں کی منطق اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض افراد اپنے مخالفین کا سامنا کرتے ہوئے اس طرزِ عمل کی پیروی کرتے ہیں جو کفر پیشہ اقوام انبیاء کے خلاف اپناتی تھیں۔

سوال : ہم یہاں مغربی اور اسلامی معاشروں کے اندر پائے جانے والے اختلافات کی ماہیت کو پیشِ نظر رکھیں تو پتا چلتا ہے کہ مغربی معاشروں میں پایا جانے والا اختلاف اکثر سیاسی افکار اور فلسفوں کے بارے میں ہے اور وہ سب اس بنیادی نکتے پر متفق ہیں کہ ان کی آراء و نظریات حقیقت سے نسبتی (Relativly) نزدیک ہیں اور ممکن ہے یکسر حق نہ ہوں' لیکن اسلامی معاشروں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اکثر مذہبی نوعیت کے ہیں اور اس سلسلے میں فقہا کی آراء مقدس اور قطعی سمجھی جاتی ہیں۔

جواب : پہلی بات تو یہ ہے کہ مغرب میں بھی مقدس امور کے بارے میں ہر دور میں اختلاف رہا ہے۔ مسیحی فرقوں کیتھولک' آر تھوڈکس اور پروٹسٹن کے درمیان انتہائی شدید اختلافات رہے ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ مسیح کی شخصیت کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ آیا آپ کی شخصیت خدائی ہے یا بشری۔

اہل مغرب بھی گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں ہی کی مانند باہم برسر پیکار رہے تھے لیکن بالاخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عقیدتی اختلاف کو ان حدود میں رکھا جائے جو ان کے لئے مشکل کا سبب نہ بنیں۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ فقیہ جس حکم کا استنباط کرتا ہے اسکے بارے میں اسکا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ یہی خدا کا حکم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی مانتا ہے کہ اسکا اخذ کردہ حکم ظنی ہے قطعی نہیں۔ کیونکہ اس کے استنباط کے مبانی ظنی مقدمات سے حاصل شدہ ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ جس چیز کو وہ بیان کرتے ہیں وہ پست ترین مقدمات (اخس المقدمتین) کے تابع ہے۔

جب فقیہ یہ جانتا ہے کہ اس نے جس حجت اور دلیل پر اعتماد کیا ہے اس کا نتیجہ حتمی نہیں بلکہ ظنی ہے تو قدرتی بات ہے کہ اسکے پاس دوسرے کی رائے کو درست اور حقیقت پر مبنی سمجھنے کا امکان موجود ہے۔

یہ کہنا کہ اسلام حقیقتِ مطلق کا مالک ہے اور یہ کہنا کہ مجتہدین حقیقتِ مطلق کے حامل ہیں' ان دونوں باتوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ یہ کہنا کہ مجتہد کی رائے حقیقت مطلق ہے مصوّبہ کا عقیدہ ہے لیکن فقہا خصوصا شیعہ امامیہ تصویب کا عقیدہ نہیں رکھتے اور اپنے آپ کو مصیبِ قطعی نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ہمارے یہاں مشہور ہے کہ ان اللہ حکما واحدا یصیبه من یصیبه و یخطاه من یخطاه (یعنی خدا کا ایک ہی حکم ہے' جس نے اسے دریافت کر لیا' اس نے دریافت کیا اور جس نے دریافت نہیں کیا اس نے غلطی کی

ہے۔)

بسااوقات مجتہد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جو چیز اس نے اجتہاد کے ذریعے اخذ کی ہے اسکے بارے میں اس پر حجت تمام ہو گئی ہے۔ یہ کہنے اور حکم کو قطعی اور حتمی سمجھنے میں بہت فرق ہے۔ لیکن اگر اسکے بر عکس کہا جائے (کہ مجتہد نے جو رائے اخذ کی ہے وہ حتمی اور قطعی ہے) تو پھر مجتہدین کی آراء میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اسکی کیا تفسیر کی جائے گی ؟ بنابرایں کس طرح ممکن ہے کہ ایک مجتہد دوسرے مجتہد کی صرف اس بنا پر تکفیر کرے کہ اس نے استنباط میں غلطی کی ہے ؟ (جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ اس نے استنباط کے دوران اجتہاد کے معروف طریقوں کو اختیار کیا ہے)۔

ایسے لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی رائے حقیقتِ مطلق ہے وہ کم و بیش پسماندہ ذہنیت کے مالک ہیں کیونکہ وہ اس جانب بھی متوجہ نہیں ہوتے کہ ان کے عمل کا اسلوب ظنی ہے قطعی اور یقینی نہیں ہے۔

اس بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بہت سے مسلمان محققین (خواہ وہ فقہ سے متعلق ہوں یا کلام سے) کی مشکل یہ ہے کہ وہ فقہی یا کلامی اختلاف کے بارے میں افراط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

سوال : کیا ہم قرآن کریم یا دوسرے اسلامی مصادر سے آزادی کا مفہوم معلوم کر سکتے ہیں ؟

جواب : انسان کی فکری آزادی کے مسئلے کو قرآن کریم سے باسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ کلام الٰہی میں آیا ہے کہ : وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر (اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے' اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ سورۂ کہف ۱۸- آیت ۲۹) انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا (یقیناً ہم نے اسے راستے کی ہدایت دے دی ہے

چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفران کرنے والا ہو جائے۔ سورۂ انسان ۷۶ - آیت ۳)

بنابر ایں انسان سوچ بچار، فکر و رائے میں آزاد ہے اور انسان کی صورت میں اس کی تخلیق اسی صورت میں با معنی بھی ہے۔ اس بنیاد پر آزادی انسان کی ذات سے جدا اور علیحدہ کوئی چیز نہیں کہ جسے دوسری (اس سے علیحدہ) چیزوں کی مانند چھینا جا سکے یا اسکے لئے ممنوع کی جا سکے۔ یہ انسان کے لئے ایک ذاتی امر ہے کیونکہ خداوند عالم نے اسے آزاد خلق کیا ہے۔

البتہ ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند عالم انسان کی آزادی کا قائل ہونے کے بعد اسے یہ بھی باور کراتا ہے کہ یہ آزادی بے لگام نہیں بلکہ ذمے داریوں کے ہمراہ ہے اور اسے اس آزادی کے استعمال کے مثبت اور منفی نتائج کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔

اسی طرح یہ بھی طبیعی ہے کہ ہر نظام کو معاشرے میں عمومی نظم و نسق کی حفاظت کے لئے لوگوں کی آزادی کے نتیجے میں سامنے آنے والے مثبت اور منفی نتائج پر گہری نگاہ رکھنی چاہئے کیونکہ بسا اوقات ایک شخص کی آزادی دوسرے لوگوں کی آزادی کے لئے ضرر رساں ہوتی ہے۔

البتہ اگر فکری آزادی سے یہ مراد لی جائے کہ لوگوں کو اپنے ہر طرح کے افکار حتیٰ ایسے افکار کی نشر و اشاعت کی بھی آزادی دی جائے جو عقیدتی، شرعی یا مفہومی اعتبار سے اسلام یا اسلامی نظام کی مخالفت پر مبنی ہوں تو ایسی فکری آزادی کے معاشرے پر مثبت یا منفی اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مسئلے پر تحقیق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔

ہمارے بہت سے فقہاء نے کتبِ ضلال کو پڑھنے (سوائے اس صورت میں جب ان کا مطالعہ کر کے ان کی رد کرنا مقصود ہو) انہیں محفوظ رکھنے اور ان کی نشر و اشاعت کے حرام ہونے کے بارے میں گفتگو کی ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ عقل کہتی ہے کہ ان کتب کی حفاظت اور نشر و اشاعت باطل کی تقویت اور حق کی کمزوری کا سبب ہوتی ہے جبکہ ان

کتب کو محدود اور نابود کرنا حق کی تقویت اور باطل کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے اور عقل کہتی ہے کہ حق کو تقویت دینا اور باطل کو کمزور کرنا واجب ہے۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بہت سے فقہا اپنے ظن و گمان ہی کو قرینِ عقل قرار دیتے ہیں۔ ہر ایک اسی چیز کو عقلی سمجھتا ہے جسے اسکی ذہنیت اور تعلیم و تربیت عقلی قرار دیتی ہے۔ حتیٰ ہم ایسے موارد بھی دیکھتے ہیں جب ایک فقیہ کسی ایک چیز کو عقلی سمجھتا ہے اور دوسرا فقیہ اسکے یکسر بر خلاف چیز کو عقل کا فیصلہ قرار دیتا ہے۔

ہمارے خیال میں پرانے زمانے میں ایسے حالات تھے کہ لوگ افکار کو محبوس کرنے اور فکری آزادی سلب کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو جایا کرتے تھے کیونکہ اس وقت دنیا ایک محدود اور تنگ چار دیواری میں محصور تھی اور عالمی سطح پر کسی فکر کی نشر و اشاعت ممکن نہ تھی اور قدرتی بات ہے کہ ایک فکر پر دباؤ اسکی کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔ لیکن آج دنیا ایک چھوٹے دیہات میں تبدیل ہو چکی ہے اور فکری آزادی کا مسئلہ ایک ایسے مسئلے کی صورت میں ڈھل چکا ہے جو عالمی پیمانے پر انسانی حقوق میں سے سمجھا جانے لگا ہے اور کسی فکر پر دباؤ اور شدت کا استعمال اسے عالمی تشہیر کا موقع فراہم کر دیتا ہے (چاہے وہ فکر اس کی مستحق نہ ہو) جبکہ اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تو بہت کم لوگ اسکی جانب متوجہ ہوتے۔

اگر اسلامی عقیدے اور تعلیمات کی حفاظت کے لئے سرگرم عناصر کسی ایسی فکر سے روبرو ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ بجائے دباؤ اور حملوں کے اسے دلیل اور برھان سے رد کرنے کی کوشش کریں۔ بنابرایں ہمارے خیال میں اگر اس مسئلے کا غور اور گہرائی کے ساتھ عصر حاضر کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ کسی فکر پر جبر اور دباؤ کا استعمال اسکی تقویت اور اسکے مخالفوں کی کمزوری پر منتج ہوتا ہے۔ اسکے بر خلاف فکر کو آزاد چھوڑ دینا اسکے اثرات کی کمی اور اسکی سرگرمیوں کا دائرہ تنگ ہو جانے کا

موجب ہوتا ہے اور بسااوقات تو لوگ ان کی باتوں پر کان دھرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے چہ جائیکہ ان کی جانب کوئی رخ کرے۔

ہم نے لبنان' مصر اور عراق کے تجربے میں دیکھا ہے کہ ایسی کتابیں جن میں دین پر تنقید کی گئی ہے جب دینی حلقوں نے ان کے خلاف مہم چلائی تو ان کتابوں کی مانگ میں اضافہ ہوااور ان کے کئی کئی ایڈیشن طبع ہوئے ہیں حتیٰ ایسے لوگوں نے بھی ان کو خریدا ہے جن کی سطح کی یہ کتب نہ تھیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں ان کتب کی پیشانی پر آزادیٔ اظہار کا لیبل چسپاں ہو گیا تھا۔

مثلاً مصر میں ایک مصنف ہے جس کا نام ((نصر حامد ابو زید)) ہے' اسکی کتابیں بہت کم پڑھی جاتی تھیں۔ اس کے چاہنے والے بھی بہت کم تھے۔ لیکن جب اسکی فکر کو روکنے کی کوشش ہوئی تو اس کی کتابوں کی ایڈیشن پر ایڈیشن چھپنے لگے حتیٰ ایسے لوگوں نے بھی اسکی کتابوں کو خریدا اور انہیں پڑھا جو اسکے نام تک سے واقف نہ تھے۔ دوسرا تجربہ عراق اور لبنان کی کمیونسٹ پارٹی کا ہے۔ یہ پارٹی عراق میں سخت دباؤ میں تھی لیکن اس کے باوجود پورے عراق پر چھا گئی۔ اسکے بر خلاف لبنان میں کمیونسٹ پارٹی کو مکمل آزادی حاصل تھی لیکن تقریباً ستر برس بعد بھی وہ ایک مختصر گروہ کے سوا کسی کو جذب نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ مظلوم کے طرفدار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی کتاب آزادانہ طور پر بازار میں آتی ہے تو بسااوقات تو اس کا پہلا ایڈیشن ہی فروخت نہیں ہو پاتا اور اسکے بیشتر نسخے اسٹور ہی میں پڑے رہ جاتے ہیں۔

بنابر ایں آزادیٔ فکر کی بحث میں ہمیں آزادی دینے یا آزادی پر پابندی لگانے کے مثبت اور منفی نتائج کا گہری نظر سے جائزہ لینا چاہئے نیز یہ بھی ضروری ہے کہ حکمِ عقل کے تحت مطلق پیمانے پر اسکے بارے میں سوچنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ مسائل کے حقیقی اثرات کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہئے' خیالی اثرات کے بارے میں نہیں۔

تفاہمِ باہمی کی ضرورت

یہ انٹرویو بیروت سے شائع ہونے والے مجلّے ((البلاد)) سے لیا گیا۔

تفاہمِ باہمی کی ضرورت

سوال : بعض لوگ معتقد ہیں کہ مسلمانوں کو دوسروں سے گفت و شنید اور تبادلۂ خیال سے قبل خود آپس میں مکالمے کی ضرورت ہے' آپ کے خیال میں کیا یہ عقیدہ درست ہے ؟

جواب : اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی حیات کے تمام شعبوں میں یہی رویہ (باہمی مکالمہ) اپنانا چاہئے۔ اس لئے کہ مسلمان بکثرت مشکلات کا شکار ہیں۔ گزشتہ اور موجودہ زمانے کی مشکلات' مسلمانوں کی ایک دوسرے سے دوریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات' استکباری قوتوں کے اثر و نفوذ اور طاقتور اور چالاک دشمن کی سازشوں کے سبب ایک دوسرے کی بات نہ سمجھنا وغیرہ جیسی مشکلات۔

یہی مشکلات اس بات کا سبب بنی ہوئی ہیں کہ مسلمان ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں' بے شمار ڈالر اس بات پر صرف کئے جا رہے ہیں کہ شیعہ' سنی ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں۔ خطیر رقوم اس مقصد کے لئے مختص کی جاتی ہیں کہ حرکت آفرین اسلام کی جگہ بے روح اور جامد اسلام کو دی جائے۔ دشمن کی کوشش ہے کہ اسلام کو مساجد کے حجروں تک محدود کر دے' اسے مسلمانوں کی زندگیوں میں نافذ نہ ہونے دے۔

دشمن یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان آزادانہ غور و فکر کے ذریعے ایک دوسرے سے

مضبوط رشتے استوار کریں۔ استعمار کی جانب سے مسلسل یہ کوشش جاری ہے کہ مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ اور نسلی مسائل' اسلامی اور امت مسلمہ کے مسائل پر حاوی رہیں تاکہ کہیں مسلمان اسلامی انقلاب (جو ایران میں حضرت امام خمینیؒ کی زیر قیادت کامیاب ہوا ہے) کی جانب متوجہ نہ ہو جائیں۔

بیدار دشمن اور مکار استکبار' اسلامی انقلاب کے عظیم مقصد ((خالص محمدیؐ اسلام کی پرخروش موجوں سے مسلمانوں کی وابستگی)) کی راہ روکنے کی خاطر شیعوں کا غالی اور مشرک کے بطور تعارف کراتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ شیعہ' برادرانِ اہل سنت کے نزدیک مقدس چیزوں کی توہین کرتے ہیں۔

بعض عرب ریاستیں بے حساب پیسہ خرچ کر کے مسلمانوں کے مابین تفرقہ انگیز لٹریچر کی نشر واشاعت کرتی ہیں حالانکہ انہیں چاہئے کہ خدا کو ناپسند ان کوششوں کی بجائے علمی محافل اور کانفرنسیں تشکیل دیں تاکہ (مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے) علمائے کرام کو تعصب سے دور صحت مند ماحول میں باہمی تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم ہوں' ایک دوسرے کے درمیان تفاہم کی فضا پیدا ہو اور بے بنیاد اختلافات ختم ہوں۔ نیز انتشار و افتراق کی پر پیچ و خم راہ باہمی تفاہم کے نتیجے میں اتحاد و اتفاق کی صراطِ مستقیم میں تبدیل ہو جائے۔

شیعہ اور سنی علما باہمی اختلافی مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں اور اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ فرقوں کے مابین ان اختلافی مسائل سے کہیں زیادہ ایسے مسائل ہیں جن میں ان کے درمیان اتحاد و یکسوئی پائی جاتی ہے اور اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ اختلافی مسائل کو پیش کرنے کی بجائے ان مسائل کو ابھارا جائے جن میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کے مقدسات کی توہین سے گریز کرتے ہوئے دوستانہ و برادرانہ فضا میں زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔

اہل سنت ' شیعوں کے متعلق انحراف کا عقیدہ رکھتے ہیں اور شیعہ بھی اس بات کے معتقد ہیں کہ سنیوں کے یہاں انحراف پایا جاتا ہے۔ جب الزامات دو طرفہ ہیں تو پھر کیوں نہ ایک صحت مند ماحول میں ایک ساتھ بیٹھ کر ان اعتراضات کو پیش کیا جائے اور ایک دوسرے کے نکتۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے' اس سلسلے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ عقل و منطق کی روشنی میں خالص اسلامی مصادر (Sources) کے ذریعے ہر مسلک اپنا دفاع کرے اور اگر دفاع میں ناکام رہے تو حقیقت کو تسلیم کر لے۔

کیا قرآن کریم (ہم مسلمانوں سے) یہ نہیں کہتا کہ: جب بھی تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع و اختلاف ہو تو خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔

شیعہ اور سنی کیوں اس قرآنی حکم پر عمل نہیں کرتے اور اپنے تنازعات اور اختلافات میں خدا اور اس کے رسولؐ کو فیصل قرار نہیں دیتے۔

پیغام الٰہی «قرآن کریم» ہمارے پاس موجود ہے' پیغمبر اسلامؐ کی خالص سنت بھی ایک حد تک ہماری دسترس میں ہے۔ اگر ہم خود اپنے اختلافات کو حل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ قرآنِ کریم اور سنت نبویؐ کی جانب رجوع کر کے تفاہم و توافق قائم کریں۔

ہم اس مقدس ہدف کے حصول کی راہ میں پیہم مشغول ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ شیعہ اور سنی کے درمیان جس قدر فاصلہ ہو گا اسی قدر ان کے درمیان عدم تفاہم اور نااتفاقی کے امکانات بڑھتے چلے جائیں گے۔ ہمارا مسلسل اسرار ہے کہ اے مسلمانوں ایک دوسرے کے نزدیک آؤ تاکہ تعصب اور بے جا شور و غوغہ سے دور صفا و اخلاص سے معمور فضا میں باہم گفت و شنید کر کے ہم اپنے دیرینہ اختلافات سے نجات حاصل کریں اور خالص محمدیؐ اسلام کی اساس پر ایک دوسرے کے قریب آئیں اور مفاد پرست' تفرقہ ڈالنے والے دشمنانِ اسلام کو موقع نہ دیں اور اسلامی اتحاد سے خوفزدہ دشمن کی فرصت کو

سلب کرلیں۔ یہ روش درست نہیں کہ ایک عالم مقالہ پیش کرے اور دوسرا عالم ڈائس پر جا کے اس کی رد میں مقالہ پڑھ ڈالے اور مسلمان اس کی رد کے متن اور تحریر و تقریر کے مواد سے بے خبر رہیں۔

یہ نہایت غلط بات ہے کہ شیطانی مواقع سے استفادہ کرتے ہوئے بعض لوگ مسلمانوں کے کسی عظیم گروہ کے اعتبار و حیثیت کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور ان کے اسلام سے عشق اور اس کے احکامات کی پابندی کو خاطر میں نہ لائیں بلکہ اسے مسترد کر دیں۔ یہ کام اسلام اور تمام مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ہے۔

دنیائے کفر و استکبار مسلسل اس کوشش میں ہے کہ مسلمانوں میں کسی صورت باہمی تفاہم و توافق پیدا نہ ہو سکے۔ (اس صورت حال سے مقابلے کے لئے) ہمیں بھی وحدت و اتحاد کے قیام کے لئے مسلسل جدو جہد سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔

ہمیں چاہئے کہ مسلمانوں کو عالم اسلام کی اس عظیم مشکل سے آگاہ کریں۔ تعجب کی بات ہے کہ دنیائے کفر و استکبار کے نزدیک مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ایک مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خود مسلمانوں کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ ہمارا (ذمے دارانِ امت) کا قصور ہے کہ ہم نے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس انداز میں عوام الناس کے سامنے مجسم ہی نہیں کیا۔ ہاں یہ ہماری کوتاہی ہی ہے ------ ہمارا قصور ہے۔

جب تک فکری بنیادوں کی اصلاح نہ ہو اور بنیادی مسائل کے بارے میں فکری تفاہم و توافق تک نہ پہنچا جائے' میدانِ عمل میں ہم آہنگی کا حصول ناممکن ہے۔

جی ہاں! ہم فکری' باہمی تعاون کا مقدمہ ہے۔ ایسے افراد' گروہ اور معاشرہ جو ہم فکر نہ ہوں ہرگز ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور مدد کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جس قدر ہم فکری کا میدان وسیع ہو گا باہمی تعاون کا میدان بھی اتنا ہی وسیع ہو گا۔ اسی طرح اگر ہم فکری کا میدان تنگ اور محدود ہو گا تو مل جل کر کام کرنے کا میدان بھی تنگ و محدود ہو گا۔

ہم مسلمان خواہ کسی بھی مسلک کے پیروکار ہوں' ہمارے درمیان ہم فکری کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میدان کی وسعت آسمانوں کی وسعت بلکہ خود اسلام کی وسعت (کی مانند) ہے۔ کیا اسلام کو ایک شہر' ایک ملک یا ایک برِ اعظم تک محدود کیا جا سکتا ہے؟ کیا ممکن ہے کہ اسلام کو جو قوم و قبیلے' نسل و نژاد کو خاطر میں نہیں لاتا اور جو تمام عالم انسانیت سے مخاطب ہے اسے قبائلی' نسلی اور قومی عصبیتوں میں محبوس و محصور کر دیا جائے؟

مسلمانوں کے مابین باہمی تعاون و اشتراکِ عمل کا میدان بھی نہایت وسیع ہے لہذا ہمیں مذہبی اختلافات کو (جو قابلِ حل و قابلِ اغماض ہیں) بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے دور نہیں ہونا چاہئے اور دشمن کو بغلیں بجانے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔

ہمارا فریضہ مسلسل کوشش ہے۔ ہمیں اسلامی اتحاد کے اعلیٰ مقصد کی راہ میں جدو جہد سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔ خواہ مقصد حاصل ہو یا نہ ہو۔ ہمیں خداوند عالم سے دعا کرتے رہنا چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں حالات سازگار کرے اور اس راہ کے متلاشیوں کی توفیقات میں اضافہ کرے۔

استکبار بخوبی آگاہ ہے کہ فکری' ثقافتی اور عقیدتی وحدت' سیاسی وحدت کی تمہید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گہری منصوبہ بندی کے ذریعے مسلمانوں کے مابین ثقافتی' عقیدتی اور فکری وحدت کی راہیں مسدود کر رہا ہے تاکہ وہ کسی صورت سیاسی وحدت تک نہ پہنچ سکیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اپنی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں استکبار کو کامیابی نصیب ہو گی لیکن یہ کہتے ہیں کہ استکبار ان لوگوں کی راہ میں سخت اور مشکل رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے جو اس مقصد (اتحاد) کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

اگر ہم (اسلامی اتحاد کے مقصد میں) کامیابی کے خواستگار ہیں تو ہمیں خالص نیت

اور اسلام کی کامیابی کے جذبۂ صادق کے ساتھ اپنی نفسانی خواہشات کو ایک طرف رکھتے ہوئے خداوند عالم سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ ہمیں طاقت و قدرت عطا فرمائے' ہمارے لئے صحیح اور نپی تلی راہ کی نشاندہی فرمائے اور مسلمانوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے نزدیک کردے۔

یاس و ناامیدی شکست اور ناکامی کے اہم ترین اسباب میں شمار ہوتی ہے۔ مخلص مسلمانوں کو اپنے دلوں میں اُمتِ مسلمہ کے اتحاد و اتفاق اور اسلام کی حاکمیت کی امید زندہ رکھنی چاہئے۔

جب تک امید نہ ہو استقامت نہیں ہو سکتی اور جب تک اخلاص نہ ہو نصرتِ الٰہی سے بہرہ مند نہیں ہوا جا سکتا۔ تاریخ میں دینداروں نے ہمیشہ اخلاص اور استقلال کے سایہ میں بڑی بڑی اور وحشت انگیز مشکلات پر قابو پایا ہے اور اب آج کے مخلص اور فرض شناس مسلمانوں کی باری ہے کہ وہ اپنے اندر سے خوف و ہراس کو نکال پھینکیں (عالم اسلام کی جانب کھلنے والے) استکبار کے دروازوں کو بند کر دیں اور ناہموار راہوں کو ہموار بنائیں۔

«ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وا بشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون۔»

«جو کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور پھر استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خوفزدہ نہ ہو' ہراس نہ کھاؤ اور اس بہشت کی بشارت لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔» (سورۂ فصلت ۴۱- آیت ۳۰)

مذکورہ قرآنی آیت «رَبُّنَا اللہُ» کو اخلاص کے محور اور «اسْتَقَامُوْا» کو استقامت کے محور کے طور پر پیش کر کے اہل اخلاص و استقامت کو خبر دے رہی ہے کہ ان پر رحمت

کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ خوف و ہراس کا شکار نہ ہو' تم ہی لوگ دنیا میں سر فراز اور آخرت میں خوش بخت ہو۔

آج اگر مسلمان بدبختی میں مبتلا ہیں تو اس کا سبب فقر و غربت نہیں۔ اسلامی ممالک دولت کے عظیم ترین منابع (Resources) سے مالا مال ہیں۔ مسلمانوں کی پسماندگی اور ذلت کی اصل وجہ جسد امت میں پایا جانے والا اختلاف کا سرطان ہے جس نے مسلمانوں کو پچھاڑ کے رکھ دیا ہے اور انہیں استکبار کا بے دام غلام بنا دیا ہے۔

اگر (دنیا میں پھیلے ہوئے) ایک ارب سے زیادہ مسلمان متحد ہو جائیں تو دنیا میں ان کا بول بالا ہو' وہ محروم عوام کا استحصال کئے بغیر اور دنیا میں ظلم و ستم بپا کئے بنا عالمی سپر طاقت بن سکتے ہیں۔

☆☆☆

رسولِ اکرمؐ کے بعد اسلام کی قیادت

یہ خطاب تہران 'ایران سے شائع ہونے والے مجلّے ((موعود)) شمارہ ۲۴ سے لیا گیا۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد اسلام کی قیادت

روزِ غدیر' اسلام کی حیات کے ایک نئے مرحلے کا نکتۂ آغاز ہے۔ اس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد عالمِ اسلام کی قیادت معین ہوئی ہے' ایک ایسی قیادت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ وروش کو جاری رکھے اور مسلمانوں کو نا قابلِ حل نظر آنے والی پیچیدہ داخلی مشکلات اور خارجی خطرات سے نجات دلائے۔

معلوم حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی قیادت ایک ایسے فرد کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے جس نے اپنے پورے وجود کے ساتھ اسلام کو درک کیا ہو' اور جو اپنے مذہبی اور شرعی اقدامات کے ذریعے ایک مجسم اسلامی نکتۂ نظر پیش کر سکے اور اس کا یہ عمل مسلمانوں کے درمیان فکری افتراق وانتشار کا انسداد کرے۔

لہذا پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد عالمِ اسلام کی قیادت ایک ایسے شخص کے ذمے ہونی چاہئے جو مکمل طور پر اور بغیر کسی خطا اور غلطی کے اسلام کا علم رکھتا ہو۔

اس مقام پر اس نکتے کی جانب اشارہ ضروری ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی پوری حیاتِ مبارک جنگوں اور داخلی بحرانوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گزری۔ لہذا اس مدت میں اکثر

اسلامی مفاہیم بخوبی واضح نہیں کئے جاسکے تھے اور مسلمانوں کے لئے ضروری تمام احکام ہنوز سامنے نہ آئے تھے۔

البتہ ہم اصحابِ پیغمبرؐ کے اخلاص کے منکر نہیں' انہوں نے مکہ میں ڈٹ کر سختیوں کا مقابلہ کیا اور مخالفت کی آگ بھڑکانے والوں اور جنگ خواہوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں خداوندِ عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: محمد رسول اللہ والذین معه اشداء علی الکفار ورحماء بینهم تراهم رکعاً سجداً یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیما هم فی وجوههم من اثرالسجود۔ (محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحمدل ہیں' تم انہیں دیکھو گے کہ (وہ) بارگاہِ احدیت میں سر خم کئے ہوئے سجدہ ریز ہیں اور اپنے پروردگار سے فضل و کرم اور اسکی خوشنودی کے طلبگار ہیں' سجدوں کی کثرت کی بنا پر ان کے چہروں پر سجدے کے نشان پائے جاتے ہیں۔ سورۂ فتح ۴۸- آیت ۲۹)

بہر حال' پیغمبر اسلامؐ کو (اپنی حیات میں) اس بات کی فرصت نہ مل سکی کہ وہ اسلامی تعلیمات اور اسکی معنویات کو گہرائی کے ساتھ' ایک ایک مسلمان کے وجود میں بٹھا سکیں۔ لہذا لازم تھا کہ پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کی رہنمائی ایک ایسے فرد کے ذریعے انجام پائے جو اسلام کو فروغ دے اور اسکی تعلیمات کو مسلمانوں کے ایک ایک فرد کے وجود میں بٹھا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ مسئلۂ غدیر' اسلام کے اہم ترین مسائل میں شمار ہونے والا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ بالخصوص جبکہ حدیث کے اکثر راویوں نے آیتِ قرآن: یاایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته واللہ یعصمک من الناس (اے پیغمبر آپ اس حکم کو پہنچادیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو پہنچایا ہی نہیں

اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ سورۂ مائدہ ۵ - آیت ۶۷) کے بارے میں کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اسلامؐ اپنے (آخری) حج سے واپسی پر ((غدیرِ خم))نامی مقام پر پہنچے۔

بعض مفسرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس آیت کی شانِ نزول حضرت علیؑ کا پیغمبرؐ کے جانشین کی حیثیت سے تعارف کرانا نہیں بلکہ یہ ایک دوسری بات کے بیان کے لئے نازل ہوئی ہے۔ یہ مفسرین اب تک مذکورہ آیتِ شریفہ کی ماہیت اور اپنے اس خیال کے درمیان نسبت قائم نہیں کر سکے ہیں۔ کیونکہ مذکورہ آیت حضرت ختمیؐ مرتبت کی بعثت کے ابتدائی ایام میں نازل نہیں ہوئی، جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ (اس میں) پیغمبر اسلامؐ کو انذار و تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس زمانے میں بغیر کسی خوف وہراس کے ہر مسئلے اور حکم سے لوگوں کو آگاہ کرتے تھے جو آپؐ پر وحی کیا جاتا تھا اور اپنے اس عمل میں کسی قسم کے ضعف اور کمزوری کا شکار نہیں ہوتے تھے : وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر (اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے۔ سورۂ کہف ۱۸- آیت ۲۹)

پیغمبر اسلامؐ تبلیغِ رسالت کے دوران کسی مخالفانہ ردِ عمل کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کیونکہ اس وقت آپؐ لوگوں کے درمیان فکر، معنویت اور الٰہی راہ و روش کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ لہذا لوگوں کا منفی رد عمل آپؐ کے لئے غیر متوقع نہ تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے منفی طرزِ عمل سے رنجیدہ ہوتے تھے۔ لیکن آپؐ کی یہ رنجیدگی اور ناگواری خود اپنے لئے نہیں ہوتی تھی، بلکہ آپؐ لوگوں کے لئے رنجیدہ ہوتے تھے، کیونکہ آپؐ لوگوں کے سچے خیر خواہ اور ہمدرد تھے۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آیۂ شریف : وان لم تفعل فما بلغت

رسالته واللہ یعصمک من الناس ایک دوسرے ہی اہم مسئلے پر تاکید کر رہی ہے اور یہ مسئلہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی ولایت و جانشینی کے سوااور کچھ نہیں۔ البتہ اس مسئلے کے بارے میں کافی بحث و مناقشہ ہے۔ جب رسولِ کریمؐ نے ان الفاظ کے ذریعے پیغام پہنچایا کہ کیا میں مومنین پر خود ان سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ اسکے جواب میں حاضرین نے کہا: جی ہاں۔ پھر فرمایا: پس جس جس کا میں مولا ہوں (اب اسکے بعد) اس کا یہ علی مولا ہے۔ (۱)۔ اسکے بعد یہ آیت نازل ہوئی :الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسندیدہ بنادیا ہے۔ سورۂ مائدہ ۵- آیت ۳)۔

اس دن تک پیغمبر اسلامؐ کے بعد امتِ اسلامیہ کی قیادت کے بارے میں ایک خلا پایا جاتا تھا' (اب اعلانِ غدیر کے ذریعے) اس خلا کے پر ہونے پر دین کی عمارت مکمل ہو گئی اور خداوند عالم اس بات سے راضی ہو گیا کہ اسلام تمام عالم کا دین ہو جائے۔

یہاں پہنچ کر ممکن ہے یہ سوال پیش آئے کہ 'بعض اصحابِ رسولؐ جنہوں نے حضرت علیؑ کی ولایت سے منہ موڑا' ان کے اس عمل کی کیا تفسیر کی جاسکتی ہے؟

شاید کوئی یہ سوال کرے کہ آپ رسول مقبولؐ کی وفات کے بعد (سقیفہ کی کاروائی کے دوران) انصار کے مہاجرین سے یہ کہنے کی کیا توجیہ کریں گے کہ: ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے۔

۱- مسند احمد- ج ۱- ص ۸۴' ۸۸' ۱۱۹' ۱۵۲' معجم الکبیر طبرانی- ج ۴- ص ۲۰' ۲۰۷' کنز العمال- ج ۱۱- ص ۶۰۸ وغیرہ وغیرہ۔ اہل سنت علما' مورخین اور مفسرین نے اپنی کتب میں بکثرت مصادر کے ساتھ حدیث غدیر کا ذکر کیا ہے' ان میں سے ساڑھے تین سو افراد کا ذکر علامہ امینی نے اپنی کتاب الغدیر میں کیا ہے۔ (مترجم)

بعضِ اصحاب رسولؐ نے (مملکتِ اسلامی کے دیگر علاقوں میں بسنے والے) مسلمانوں سے کسی قسم کا مشورہ کئے بنا' اور بغیر کسی خوف و خطر اور بلا کسی ہچکچاہٹ کے حضرات ابو بکر کی بیعت کر لی ؟ کیا وجہ تھی کہ وہاں (سقیفہ بنی ساعدۃ میں) کسی نے اس عمل کی مخالفت نہ کی اور یہ نہ کہا کہ پیغمبر اسلامؐ نے تو فرمایا ہے کہ جس جس کا میں مولا ہوں (میرے بعد) اس اس کا یہ علی مولا ہے ؟

مرحوم سید عبدالحسین شرف الدینؒ نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے :

«بعض کے سوا' اس دور کے مسلمان عمیق اور گہرائی میں جا کے سوچنے والی ذہنیت کے مالک نہ تھے' لہذا جب انہوں نے بیعت کر لی تو اسکے وفادار رہے۔ بہر حال جس وقت پیغمبر اسلامؐ نے صراحت اور وضاحت کے ساتھ فرمایا تھا تو شاید انہوں نے من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ سے پیغمبرؐ کی مراد کو خوبی سمجھ لیا تھا لیکن جو کچھ (بعد میں) واقع ہوا وہ پیغمبرؐ کی خواہش کے بر خلاف تھا۔»

یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ لوگوں کی اکثریت کی (کوتاہ اندیش) ذہنیت کی جانب سے فکر مند تھے' اسی لئے آپؐ نے (آخری وقت میں) فرمایا کہ : میرے لئے قلم اور کتف (کاغذ) لے آؤ' تاکہ میں تمہارے لئے ایک ایسی چیز لکھ دوں کہ میرے بعد تمہاری گمراہی کی گنجائش نہ رہے (۱)۔

پیغمبر اسلامؐ عام افراد کی مانند نہ تھے کہ احتضار (جان کنی) کے موقع پر (نعوذ باللہ) ہذیان گوئی میں مبتلا ہو جاتے' بلکہ آپؐ عقل و شعور اور عزم و ارادے کے بلند ترین درجے پر فائز تھے۔ نیز اس قصے سے پہلے بیماری کی حالت میں آنحضرتؐ کی ہذیان گوئی کا کوئی ایک

۱- صحیح بخاری - ج ۵ - ص ۱۳۸' صحیح مسلم - ج ۲ - ص ۱۶

واقعہ بھی کسی صحابی سے نقل نہیں ہوا۔ اصولاً پیغمبرؐ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے اصحاب کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے اور ان سے گفتگو کیا کرتے تھے' آپؐ کی پوری حیات ایک کھلی کتاب کی مانند مسلمانوں کے سامنے تھی۔ لہذا جب آپؐ نے فرمایا کہ میرے لئے قلم اور کتف (کاغذ) لے آؤ تاکہ میں تمہارے لئے ایک ایسی چیز لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد کسی صورت گمراہ نہ ہو سکو۔ تو آنحضرتؐ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوئی ایسی بات لکھ دیں جو قرآن مجید کی جگہ لے لے گی۔ کیونکہ قرآن تو وہ نور ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے گوشت و پوست اور آنحضرتؐ کے خون کے ساتھ گندھا ہوا ہے۔ بنابرایں یہاں کوئی اور مسئلہ پیشِ نظر ہے جو رسول اکرمؐ کی بہت زیادہ توجہ اور اہتمام کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے آپؐ کے لئے ناگزیر کر دیا ہے کہ اس موقع پر آپؐ اس کے بارے میں تحریری صورت میں تاکید فرمادیں تاکہ مستقبل میں کوئی آپؐ کی گفتگو میں ہیر پھیر نہ کر سکے۔

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ (اس موقع پر) خلیفۂ دوم نے یہ کیوں کہا کہ ہمارے لئے کتابِ خدا ہی کافی ہے ؟ کیا پیغمبر اسلامؐ یہ کہنا چاہتے تھے کہ (نعوذ باللہ) کتاب خدا ناقص ہے ؟ خلیفۂ دوم کے : حسبنا کتاب اللہ کہنے کا کیا مطلب ہے ؟ جبکہ خداوندِ عالم کا فرمان ہے کہ : ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا (جو کچھ بھی رسول تمہیں دیدے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کر دے اس سے رک جاؤ۔ سورۂ حشر ۵۹- آیت ۷)

یہاں اس نکتے کی جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ رسول کریمؐ کی سنت' کتابِ خدا کی شارح اور اسکی تکمیل کرتی ہے۔ پس پھر خلیفۂ ثانی نے کیوں یہ کہا کہ : حسبنا کتاب اللہ ؟ (یعنی ہمارے لئے کتابِ خدا ہی کافی ہے) اور پھر اس کے بعد انہوں نے رسولِ کریمؐ کی (نعوذ باللہ) ہذیان گوئی کا دعویٰ کیا ؟ جبکہ رسول اللہؐ نے اپنی پوری حیاتِ

مبارکہ میں 'بیماری کی حالت تک میں کبھی ہذیان گوئی نہیں فرمائی۔

اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ نبوت، رسول اللہؐ کی پوری زندگی پر محیط ہے لہذا اس بات کا امکان نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ ہذیان گوئی کی حالت میں مسلمانوں کو خطاب کریں اور (اس حالت میں) انہیں ایک ایسے کام کی انجام دہی کا حکم دیں جو آپؐ کی رسالت کے تداوم واستمرار سے تعلق رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ تمام مسلمانوں کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ پیغمبر اسلامؐ ہر قسم کی غلطی اور خطا سے محفوظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبرؐ کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ خلافت کے مسئلے کو مکمل طور پر واضح کر دیں اور اپنی تحریر کے ذریعے حضرت علیؑ کی جانشینی پر تائید کی مہر ثبت کر دیں۔ البتہ رسولِ کریمؐ پہلے ہی حضرت علیؑ کی ولایت اور جانشینی کے مسئلے کو مختلف مناسبتوں سے متعدد مقامات پر بیان فرما چکے تھے۔

بہر حال جب چند افراد آنحضرتؐ کی خدمت میں قلم و کتف (کاغذ) لے کر حاضر ہوئے' تو اس موقع پر اختلاف پیدا ہو گیا اور ایک گروہ نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ پیغمبرؐ اپنی تحریر کے ذریعے حضرت علیؑ کا اپنے جانشین کے طور پر تعارف کرائیں۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ پہلے ہی سے مسلسل اپنے اصحاب اور سربر آوردہ افراد کو حکم دے رہے تھے کہ «اسامہ» کے لشکر کے ساتھ روم روانہ ہو جائیں۔ لیکن ان لوگوں نے رسول اللہؐ کے حکم کی تعمیل نہ کی اور «اسامہ» کے لشکر میں شامل نہ ہوئے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ (خلیفۂ دوم) نے یہ کیوں کہا کہ پیغمبرؐ کی وفات نہیں ہوئی ہے؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ وہ لوگ جو اس وقت مدینہ میں موجود نہیں ہیں انہیں اس بات کا موقع مل جائے کہ وہ سقیفہ کی کاروائی میں شریک ہو سکیں اور مسئلۂ خلافت کو اس خاص انداز سے پایۂ تکمیل کو پہنچائیں۔

تاریخ پر نقد و تحلیل

جب ہم تاریخِ اسلام کا ایک نئے انداز سے مطالعہ کرنا چاہیں تو ہمیں مسئلہ غدیر کا بھی ایک ناقدانہ جائزہ لینا چاہئے' البتہ اس دور کی شخصیات کے تقدس کو مجروح کئے بغیر۔

بعض لوگوں نے حضرت علیؑ کے خطبہ 'شقشقیہ پر' جسے سید رضیؒ نے نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے' چند اعتراضات کئے ہیں۔ اس گروہ کے اعتراضات کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؑ کا طرزِ خطابت سید رضیؒ کے اندازِ سخن سے مختلف ہے۔ مزید یہ کہ مذکورہ خطبے کو سید رضیؒ سے صدیوں برس پہلے متعدد دوسرے راوی نقل کر چکے ہیں۔ حضرت علیؑ نے اس خطبے میں اپنے حق کے بارے میں فرمایا:

«محلی منها محل القطب من الرحا' ینحدر عنی السیل' ولا یرقی الی الطیر۔»

«خلافت میں میرا مقام (علمی اور عملی لحاظ سے) چکی کی مرکزی کیل کا سا ہے۔ علم کا سیلاب میری ذات سے گزر کر نیچے جاتا ہے اور میری (علم و دانش کی) بلندی تک کسی کا طائرِ فکر پرواز نہیں کر سکتا ہے۔»

(نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

یہاں تک کہ فرماتے ہیں:

«فیا عجبا !! بینا هو یستقیلها فی حیاته اذا عقدها لاخر بعد وفاته لشد ما تشطر اضرعیها !»

«حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں استعفا دے رہے تھے لیکن اپنے بعد (خلافت) دوسرے کے لئے معین کر گئے۔ بے شک دونوں نے مل کر شدت کے ساتھ اس کے تھنوں کو دوہا ہے۔»

(نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

اس مثال کے ذریعے امام علیؑ کی مراد یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات حصولِ خلافت کے سلسلے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ اور حق طلب کرنے والی ہر آواز کو کچل دینے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ سیاسی حالات بھی اسی رخ پر بڑھ رہے تھے۔ اس زمانے میں حضرت علیؑ اس بات سے بخوبی باخبر تھے کہ اس دور کا اسلامی معاشرہ اس بات کے لئے تیار نہیں کہ آپؑ اپنے حق کے حصول کے لئے تلوار اٹھائیں۔ کیونکہ آپؑ کا یہ عمل مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور افتراق کا باعث ہوتا۔ لہذا آپؑ نے فرمایا:

«فرایت ان الصبر علی هاتا احجیٰ فصبرت وفی العین قذًی، وفی الحلق شجاً»

«میں نے دیکھا کہ ان حالات میں صبر ہی قرینِ عقل ہے، تو میں نے اس عالم میں صبر کیا کہ آنکھوں میں خس و خاشاک تھے اور گلے میں ہڈی اٹکی ہوئی تھی۔» (نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

جب ابو سفیان، حضرت عباس کے ساتھ، امیر المومنینؑ کے ہاتھ پر بیعت کی غرض سے آپؑ کی خدمت میں آیا تو آپؑ نے دستِ بیعت دراز نہ کیا اور انہیں آگاہ کیا کہ اگر آپؑ نے اپنے حق میں بیعت لی تو اسکے نتیجے میں کیا فتنہ سر اٹھائے گا۔ مزید یہ کہ زمانی اور مکانی حالات بھی آپؑ کو اس عمل کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ کیونکہ رسالتِ الٰہی پر عمل کے لئے مخصوص خارجی حالات درکار ہوتے ہیں۔ تاکہ انسان اپنے ذمے عائد ہونے والے الٰہی فریضے کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکے۔ لہذا اگر رسالتِ الٰہی کی انجامدہی کے راستے میں بہت زیادہ خارجی رکاوٹیں پائی جائیں تو ممکن ہے کہ یہ الٰہی فریضہ انجام نہ دیا جا سکے، اور یہ عمل ناکامی سے دوچار ہو جائے اور پھر اسکے بعد اس رسالتِ الٰہی کا محض نام باقی رہ جائے۔ لہذا پیغمبرؐ کے بعد اس رسالت کے حامل کے لئے ناگزیر ہو گیا تھا کہ وہ دینِ پیغمبر کی بقا کی خاطر اپنے آپ کو فدا کر دے۔

لہذا حضرت علیؑ اپنے تمام تر علم و دانش، روحانیت اور بصیرت کے باوجود محض بقائے دیں کی خاطر اپنے برحق مطالبے سے دستبردار ہو گئے اور دوسرے لوگ مسندِ خلافت پر براجمان ہوئے جو نہ تو آپؑ کی طرح علم و دانش کے مالک تھے اور نہ ہی آپؑ کے جیسے شعور اور مہارت کے حامل۔

رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد (سقیفہ میں) انصار کی طرف سے خلافت کو بھی (یہ کہہ کر) قبیلائی نظام کی بنیاد پر پیش کیا گیا کہ: ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے۔ اس مسئلے کا کسی ایسے معیار اور پیمانے سے بھی کوئی تعلق نہ تھا جسے معاشرے کی قیادت کے انتخاب کے موقع پر پیش نظر رکھا جاتا ہو اور یہ اسلام کی پیش کردہ عمومی ہدایات کے دائرے سے بھی باہر تھا۔

مسئلہ خلافت کے بارے میں تحقیق

ہم نے اس موضوع (خلافت) پر جو تحقیقات انجام دی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اس دور کے لوگ (اس بارے میں) واضح اسلامی تعلیمات اور رہنمائی سے بہرہ ور نہ تھے۔ ان کی نظر میں مسئلہ یہ تھا کہ پیغمبرؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہمیں اپنے معاشرے کی قیادت کے لئے ایک قائد کا تعین کرنا ہے، اب اس انتخاب کی خواہ کوئی بھی صورت ہو۔ اس مسئلے میں دراصل یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ مسئلہ یہ نہیں کہ ایک شخص پر کوئی خاص راہ و روش مسلط کی گئی تھی بلکہ موضوع یہ ہے کہ ایک شخص نے خاص راہ و روش کو لوگوں پر مسلط کیا۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا:

«حتی اذا مضیٰ لسبیله جعلها فی جماعة زعم انی احدهم، فیا لله وللشوریٰ! متی اعترض الریب فی مع الاوّل منهم-»

«یہاں تک کہ انہوں نے بھی اپنی راہ لی، لیکن مسئلۂ خلافت کو ایک جماعت

میں قرار دے گئے، جن میں سے ایک مجھے بھی گمان کیا گیا۔واللہ ! اس شوریٰ سے میرا کیا تعلق ؟ پہلوں ہی کے مقابلے میں مجھ میں کونسا عیب و ریب تھا کہ آج لوگوں نے مجھے ان افراد (وہ پانچ افراد جنہیں خلیفۂ ثانی نے شوریٰ میں نامزد کیا تھا) کے ساتھ لا کھڑا کیا۔» (نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

ان افراد کے درمیان کس طرح امتیاز قائم کیا جائے ؟ وہ کیا پیمانہ ہے جس کے ذریعے ان میں سے بہتر اور افضل کو پہچانا جائے ؟ یہ لوگ کتنے علم و آگہی کے مالک ہیں ؟ ان کی سطح فکری کیا ہے ؟ انہوں نے کتنا کتنا جہاد کیا ہے ؟ یہ لوگ رسول مقبولؐ سے کتنی روحانی اور ذہنی قرابت رکھتے ہیں ؟

جب ہم اس مسئلے کا علمی نکتۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو امام جعفر صادقؑ کے اس کلام کی درستگی کو محسوس کر لیتے ہیں جس میں آپؑ نے فرمایا تھا کہ : حضرت علیؑ نے فرمایا : میں کہاں اور وہ کہاں ! ؟

جس زمانے میں پیغمبر اسلامؐ، حضرت علیؑ کو اپنی جانشینی اور خلافت کے لئے تیار کر رہے تھے اور ان مسائل کی آپؑ کو تعلیم دے رہے تھے جنہیں کوئی دوسرا نہ جانتا تھا، لوگوں نے اسی زمانے سے سن رکھا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں فرمایا ہے : میں علم کا شہر ہوں اور علی اسکا دروازہ۔اور : علی حق کے ساتھ ہے اور حق علی کے ساتھ۔ اور : جس کسی کا میں مولا ہوں پس یہ علی اسکا مولا ہے۔یا : اے علی ! آپ میرے لئے اسی طرح ہیں جیسے موسیٰ کے لئے ہارون تھے، فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔اور فرمان الٰہی ہے :

«انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھر کم تطھیرا۔»

«بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہلِ بیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس

طرح پاک وپاکیزہ رکھے جیساپاک وپاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔»

(سورۂ احزاب ۳۳-آیت ۳۳)

نیز فرماتا ہے :

«انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلاۃ ویوتون الزکوۃ وھم راکعون۔»

«ایمان والو! بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ صاحبانِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے اور حالتِ رکوع میں زکات دیتے ہیں۔»

(سورۂ مائدہ ۵-آیت ۵۵)

اسی طرح فرماتا ہے :

«ومن الناس من یشری نفسہ ابتغا ء مرضات اللہ واللہ روف بالعباد۔»

«اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو پروردگار کی مرضی کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔»

(سورۂ بقرہ ۲-آیت ۲۰۷)

اس بنیاد پر دیکھا جائے تو حضرت علیؑ کا دکھ اور تکلیف اپنے لئے' اپنی ذات کے لئے نہ تھا' بلکہ آپ کا غم واندوہ اسلام کے لئے تھا' امتِ اسلامیہ کے لئے تھا۔ آپؑ نے خطبۂ شقشقیہ میں فرمایا :

«فصغا رجل منھم لضغنہ ومال الاخر لصھرہ مع ھنٍ وھنٍ الی ان قام ثالث القوم نافجا حضنیہ۔»

«مگر پھر بھی ایک شخص اپنے کینے کی وجہ سے مجھ سے منحرف ہو گیا اور دوسرا دامادی کی وجہ سے ادہر جھک گیا اور اسی طرح دو اور افراد بھی جن

کے نام لینا مناسب نہیں----»(نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

آپؑ کے مصبِ خلافت پر فائز ہوتے ہی آپؑ کے راستے میں سازشوں کے کانٹے بوئے جانے لگے۔ اس بارے میں خود آپؑ کا کلام ہے :

«فلما نہضت بالامر نکثت طائفة ‘و مرقت اخری ‘ وقسط آخرون ‘ کانھم لم یسمعو اللہ سبحانه (فسق) یقول : تلک الدار الاخرة نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا ‘ والعاقبة للمتقین۔»(سورئه قصص ۲۸ - آیت ۸۳)

«لیکن جب میں نے حکومت سنبھال لی اور اٹھ کھڑا ہوا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ دی اور دوسرا میری بیعت سے نکل گیا۔ اور تیسرے نے فسق اختیار کر لیا۔ جیسے کہ ان لوگوں نے یہ ارشادِ الٰہی سنا ہی نہ ہو کہ یہ دارِ آخرت ہم صرف ان لوگوں کے لئے قرار دیتے ہیں جو دنیا میں بلندی اور فساد نہیں چاہتے اور عاقبت صرف اہلِ تقویٰ کے لئے ہے۔»

(نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

«بلی !واللہ لقد سمعوھا ووعوھا‘ ولکنھم حلیت الدنیا فی اعینھم ‘ وراقھم زبر جھا۔»

«ہاں ہاں !! خدا کی قسم ان لوگوں نے یہ ارشاد سنا بھی ہے اور سمجھے بھی ہیں لیکن دنیا ان کی نگاہوں میں آراستہ ہو گئی اور اس کی چمک دمک نے انہیں اپنا فریفتہ بنا لیا۔»(نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

پس امامؑ نے اپنے پہلے موقف پر زور دیتے ہوئے فرمایا :

«اما والذی فلق الحبة ‘ وبرا النسمة ‘ لولا حضور الحاضر

، وقيام الحجة بوجود الناصر، وما اخذ الله على العلماء الايقاروا على كظة ظالم ، ولا سغب مظلوم ، لا لقيت حبلها على غاربها، ولسقيت آخر ها بكاس اوّلها ، ولا لفيتم دنياكم هذه ازهد عندى من عفطة عنزا!۔»

«آگاہ ہو جاؤ کہ وہ خدا گواہ ہے جس نے دانے کو شگافتہ کیا ہے اور ذی روح کو پیدا کیا ہے کہ اگر حاضرین کی موجودگی اور مددگاروں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور اللہ کا علما سے یہ عہد نہ ہو تا کہ خبر دار ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک پر چین سے نہ بیٹھنا تو میں آج بھی اس خلافت کی رسی کو اسی کی گردن پر ڈال کر ہنکا دیتا اور اسکے آخر کو اوّل ہی کے کاسے سے سیراب کرتا اور تم دیکھ لیتے کہ تمہاری دنیا میری نظر میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ بے قیمت ہے۔» (نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ ہم کسے نمونۂ عمل قرار دیں ؟

جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ مسندِ خلافت پر بیٹھنے والوں میں سے صرف حضرت علیؑ نے ہمارے لئے عظیم علمی اور تمدنی میراث چھوڑی ہے، جو اسلام کی وسعت اور پھیلاؤ کا موجب ہے۔ لہذا علیؑ کا شیعہ ہونے کے معنیٰ، حضرت علیؑ کا پیروکار ہونا، اسلامی اتحاد کا محافظ ہونا، یہاں تک کہ اگر عالمِ اسلام کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو اس سے دفاع کے لئے خم ٹھونک کر تیار ہونا۔

حضرت علیؑ کا دل، لوگوں کی محبت اور ان کی خیر خواہی کے جذبات سے سرشار تھا، حتیٰ اپنے مخالفوں کے لئے بھی اسی طرح دھڑکتا تھا (البتہ دشمنانِ خدا اور دشمنانِ رسولِ خداؐ کے لئے نہیں)۔

بہر صورت، حضرت علیؑ کو جو مشکل اور مصیبت اٹھانی پڑی اس میں اب تک کوئی

اور مبتلا نہیں ہوا۔

عزیزو! ہمیں چاہئے کہ حضرت علیؑ کی حیاتِ مقدس کے بارے میں حقیقت پسندانہ تحقیق کریں اور دیکھیں کہ مشکلات کا سامنا کرتے وقت آپؑ کے سعہ صدر (سینے کی کشادگی) کی کیفیت کیا تھی؟ آپؑ میں صبر کی قوت کتنی تھی؟ آپؑ نے اسلام کی بھاری ذمے داریوں کو کس طرح اپنے کاندھوں پر اٹھایا؟ مسلمانوں کے امور کی ذمے داری کا احساس کس قدر آپؑ کی عقل اور آپؑ کی روح میں پیوست تھا؟

کیا غدیر کے دن محض جشنِ مسرت کا انعقاد کافی ہے؟

ہم کسی کو «جشنِ غدیر» کے شایانِ شان انعقاد سے روکنا نہیں چاہتے' البتہ کیونکہ غدیر ایک علمی اور معنوی سرمایہ ہے لہذا علما' مفکرین اور ادیبوں کو اس عظیم الشان دن ان امور کے بارے میں اپنی تحقیقات کو سامنے لانا چاہئے جن امور کی نشاندہی حضرت علیؑ نے فرمائی تھی تاکہ عقیدتی' اسلامی' سیاسی اور اجتماعی مسائل میں مسلمانوں کے درمیان حضرت علیؑ کی شخصیت کو اسکا حقیقی مقام مل سکے۔ اس قسم کی تحقیقات حضرت علیؑ کی شخصیت کے ہماری فکر' قلب اور حیات میں نفوذ کا موجب ہوں گی۔ اسی صورت میں حضرت علیؑ' ہمیشہ ہمارے نزدیک معاشرے کی نبض کی مانند عمل کریں گے۔ حضرت علیؑ کی فکر تمام زمانی سرحدوں سے ماوراء ہے۔

عزیزو! حضرت علیؑ سے ہماری محبت' ہمارے کاندھوں پر ایک بھاری ذمے داری عائد کرتی ہے۔ لہذا ہمیں اپنے کردار و اعمال کا' آنحضرتؐ کے کردار و عمل سے موازنہ کرنا چاہئے' ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی پوری زندگی ہر پہلو سے حضرت علیؑ کی زندگی کی مانند بسر کریں۔ کیونکہ حضرت علیؑ کی زندگی میں اللہ رب العزت' آپؑ کے قلب' عقل اور پوری زندگی میں موجود تھا۔ پس آیئے' علیؑ کی طرف آیئے تاکہ ان کی حقیقت معلوم ہو سکے' کیونکہ علیؑ تاریخ کے کسی ایک حصے تک محدود رہنے والی ہستی نہیں۔

اسلام اور عورت کا معاشرتی کردار

یہ خطاب دفتر تبلیغاتِ اسلامی حوزۂ علمیہ قم المقدس ایران سے شائع ہونے والے خواتین کے مقبول ماہنامے ((پیام زن)) سے لیا گیا۔

اسلام اور عورت کا معاشرتی کردار

ایک بڑی مشکل جو اجتماعی تحریکوں' بالخصوص انسانی اقدار کے سلسلے میں دین کی تحریک کو محدود کرتی ہے وہ زندگی کے مختلف مراحل میں انسان کے سامنے آنے والی مشکلات اور مسائل کے بالمقابل اس کا طرزِ عمل ہے۔ یہ امر اس بات کا سبب بنتا ہے کہ صحیح غور و فکر' دین اور تحریک کی اصل حرکت فراموش کر دی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں انسان، بہت سے مواقع پر اپنے گرد و پیش کے حالات و شرائط کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ جبکہ یہ حالات و شرائط اسلاف کے عقائد سے حاصل شدہ میراث' معاشرتی عادات و اطوار اور دوسری اقوام کے قرب یا ان کے ساتھ رہن سہن سے وجود میں آنے والی رسوم و رواج کے سوا کچھ نہیں ہوتے' اور ان کی کوئی اور حقیقت اور حیثیت نہیں ہوتی۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مواقع پر دین کے آغاز اور معاشرے کے وجود میں آنے کی ایسی غلط تفسیر کی جاتی ہے یا اسے ایسا منحرف بنا دیا جاتا ہے، کہ علاج کی ایسی راہیں جن کی جڑیں عین معارفِ دینی میں پائی جاتی ہیں وہ بھی ان منفی رجحانات کی روک تھام سے عاجز رہتی ہیں۔

یوں رفتہ رفتہ یہ منفی رجحانات' مثبت اور درست رجحانات کے مقابل پھلتے پھولتے

ہیں اور ان کی بنیاد پر وجود میں آنے والے عقائد، فکر اور ذہن میں گھر کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا ذہن اور اسکی فکر منتشر اور گمراہ اعتقادات کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔

ہر چند فکر کی قوت بہت سی گمراہیوں اور کج رویوں کو دریافت کر سکتی ہے، لیکن تاریخ میں ہمیشہ ہر زمان و مکان میں درست اور غلط رجحانات ایک دوسرے سے خلط ملط رہے ہیں۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ صحیح فکر اور درست راستے کو دریافت کرنے کے لئے خالص اور پاکیزہ سر چشموں جیسے آیات و روایات میں غور و فکر کریں اور ان سر چشموں سے استفادہ کریں۔

فکرِ اسلامی میں عورت کا مقام

اہم فقہی اور اسلامی مسائل میں سے ایک "عورت" کا مسئلہ ہے۔

اسلام میں عورت کا مفہوم کیا ہے؟

عورت کا انسانی کردار کیا ہے، بالفاظ دیگر اسکی انسانیت کا دائرہ کس حد تک وسیع ہے؟

معاشرے کو درپیش مسائل میں اسکا کردار کیا ہے؟

نیز کیا اسلامی معاشرہ ایک مکمل طور پر بند معاشرہ ہے جس میں اجتماعی میدان میں عورت مرد کے دوش بدوش کھڑی نہیں ہو سکتی؟ یہاں تک کہ سوائے گھریلو تعلق کے مرد و زن کے درمیان کوئی اور ربط و تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اور عورت کو معاشرتی مسائل میں شمولیت کا کوئی موقع نہیں ملنا چاہئے؟

کیا عورت مختلف میدانوں میں کسی بھی قسم کی سرگرمیوں سے محروم رکھی گئی ہے؟

تمام ہی اسلامی معاشروں میں اس قسم کے سوالات پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اس حوالے سے خطرناک مشکلات میں سے ایک مشکل مسلمان علما کا ایک گروہ ہوتا ہے کہ جن کے درمیان کچھ فقہا بھی نظر آتے ہیں۔

اس گروہ کی کوشش ہوتی ہے کہ بغیر غور و فکر کے آیات و روایات کے مفاہیم دریافت کر لیں۔۔ وہ اس دوران ان معلومات سے استفادہ کرتے ہیں جو ان کے اذہان میں بیٹھ چکی ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایسا انسان کسی آیت یا حدیث کے مفہوم تک اس وقت تک پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک وہ اسکے ذہن میں تسلیم شدہ ان مفاہیم سے گزر نہ جائے، یا ان مسائل سے جو ادہر ادہر سے اس کے ذہن میں نقش ہو گئے ہیں مدد نہ لے لے۔ یہ مسائل رفتہ رفتہ ذہن میں 'بدیہی حقائق (یعنی بالکل سامنے کی سی باتیں) نظر آنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ان کی مخالفت ہو تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی انتہائی واضح امر کی مخالفت ہوئی ہے۔

ایسی صورت میں کس طرح ممکن ہے کہ یہ انسان ایسی باتوں کی مخالفت کر سکے جو اس کے لئے مسلم الثبوت ہوں؟

اسلام کے سیاسی معاشرے کے بنیادیں

اس مختصر فرصت میں (کیونکہ ہمارے خیال میں اس قسم کے موضوع پر گفتگو کے لئے وسیع تحقیق اور تجزیے کی ضرورت ہے) ضروری ہے کہ ہم انسان کے بارے میں اسلام کے سیاسی نکتۂ نظر کا جائزہ لیں۔

شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے نکتۂ نظر سے وہ اہم ترین رکن، جس پر اسلامی سیاست کی بنیاد رکھی گئی ہے «عدالت» ہے۔ کیونکہ ارشاد الٰہی ہے:

«لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط۔۔۔۔۔»

«بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔» (سورۂ حدید ۵۷ - آیت ۲۵)

عدالت کا قیام تمام آسمانی ادیان کا پیغام ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہم کسی رائے، مفہوم یا طریقہ کار کی اچھائی یا برائی کے بارے میں جاننا چاہیں تو ہمیں چاہئے کہ اسے عدل کے میزان پر پرکھیں۔ اگر وہ عدالت کے معیار پر پورا اترے تو برحق ہے، اور اگر راہ عدالت سے دور ہو تو یقیناً دین کی راہ سے بھی جدا ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں اشارہ موجود ہے کہ اسلام، خدا کے لئے، انسان کے ذریعے عدالت کے قیام کے سوا کچھ اور نہیں اور انسان کو چاہئے کہ وہ دوسری تمام ذمے داریوں کی مانند اس ذمے داری کو بھی اپنے دوش پر اٹھائے۔ کیونکہ خداوند عالم نے اپنے ارادے اور خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو یقیناً عدل و انصاف کا قیام ہے انسان کو زمین پر اپنا جانشین منتخب کیا ہے۔

پس انسان ہونے کے ناطے جب تک ہم خود کو دین کے سامنے جوابدہ سمجھتے ہیں، اس وقت تک لازماً عدالت کے قیام کی سنگین ذمے داری بھی ہم سب کے کاندھوں پر رہے گی۔ تمام امور اور انسان کی تمام توانائیوں میں عدالت کو پیش نظر رکھا جانا چاہئے۔ خواہ یہ مسائل بڑے بڑے ہوں' اور خواہ وہ توانائیاں ایک معمولی انسان میں پائی جاتی ہوں۔ اگر کوئی انسان عدالت کے قیام کی کوششوں میں شریک ہو تو اسے چاہئے کہ اپنی تمام توانائیوں سے ممکنہ حد تک استفادہ کرے۔

عدالت کا قیام' مرد و زن کی ایک مقدس ذمے داری

شاید اب تک ذہنوں میں یہ سوال ابھر چکا ہو گا کہ کیا عدالت کا قیام صرف مردوں کی ذمے داری ہے؟ بالفاظ دیگر کیا خداوند عالم نے عدالت کے قیام کا تقاضا صرف مردوں سے کیا ہے؟ یا اس سلسلے میں خواتین بھی جوابدہ ہیں؟ کیونکہ آیت قرآن تو تمام لوگوں کو عدالت کے قیام کا ذمے دار قرار دے رہی ہے۔

اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈالتے ہی' آسانی کے ساتھ ہم یہ بات جان لیتے ہیں کہ

عدالت کے قیام کے لئے عورتوں کی توانائیاں بھی ضروری ہیں کیونکہ عورتیں بھی فکری، ذاتی اور اجتماعی پہلوؤں سے اس سلسلے میں موثر واقع ہوتی ہیں۔

یہ بات بہت آسانی کے ساتھ سمجھی جا سکتی ہے کہ عدل و انصاف کے قیام کے سلسلے میں عورت کا معاشرتی کردار بھی قابلِ اہمیت ہے اور جس طرح مرد اس سلسلے میں ذمے دار ہے اسی طرح عورت پر بھی یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ البتہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم مردوں اور عورتوں کے کردار کو ایک دوسرے سے جدا کریں اور ہر ایک کے کردار کا علیحدہ علیحدہ مخصوص دائرے میں رکھ کر اسکا جائزہ لیں۔ بلکہ ہم معاشرے میں ایسی ذمے داریاں بھی دیکھتے ہیں جو مرد و زن کے درمیان مشترک ہیں اور ان دونوں میں سے ہر کوئی بڑھ کر انہیں ادا کر سکتا ہے۔

ہر چند کچھ ذمے داریاں صرف عورت سے مخصوص ہیں لیکن بہت سے مواقع پر عدالت کے قیام کے سلسلے میں مرد و زن میں سے ہر ایک دوسرے ہی کی مانند موثر ہو سکتا ہے۔ بے شک وہ مخصوص کردار جو جنسیت کی بنیاد پر استوار ہیں عمومی اور اجتماعی کرداروں کو ختم نہیں کر سکتے۔

اسلامی سیاست کے میدان میں عورت کا حق

بعض لوگ عورت کے اجتماعی کردار کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کچھ لوگ عورت کی ذمے داری کو صرف اور صرف اپنے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال تک محدود کر دیتے ہیں اور اس کے کسی اجتماعی کردار کو قبول نہیں کرتے۔ البتہ یہ انحراف دوسرے اجتماعی پہلوؤں میں بھی بخوبی نمایاں ہے۔ جیسے کہ کبھی لوگوں کا ایک گروہ اپنی تمام سرگرمیوں کو صرف کسی ایک میدان میں مرکوز کر دیتا ہے اور اپنے معاشرتی فرائض اور ذمے داریوں سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ ایک دیرینہ مشکل ہے۔

اسی طرح آج بھی ہم کچھ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے پاتے ہیں کہ علمائے دین کو سیاسی

مسائل میں دخل نہیں دیناچاہئے۔ کیونکہ ان کی ذمے داری صرف دینی مسائل تک محدود ہے۔ درست ہے کہ علمائے دین کا فریضہ دینی مسائل کی تحقیق اور ان کے بارے میں غور و فکر ہے۔ لیکن سیاسی رہنمائی کے سلسلے میں ان کی انسانی ذمے داری کس طرح فراموش کی جاسکتی ہے ؟

اگر علما کا کردار صرف ایک پہلو میں محدود ہو جائے، تو بے شک معاشرتی زندگی میں ان کے انسانی پہلو ختم ہو جائیں گے۔ اسی لحاظ سے اگر ہم عورت کی ذمے داریوں کے دائرے کو بھی محدود کریں تو اس کے انسانی کردار کے بارے میں سوال اٹھے گا۔

ہم معاشرتی زندگی میں عورت کے انسانی کردار کو کسی صورت بھی معمولی نہیں سمجھتے۔ لہذا ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب کی مانند اسلام کے نکتۂ نظر سے بھی تمام انسانوں کو عدل و انصاف کے قیام کی دعوت دی گئی ہے اور اسکے معنی یہ ہیں کہ تمام انسانوں کو حتیٰ الامکان اس سلسلے میں کوشش اور جدوجہد کرنی چاہئے۔

ہر انسان کچھ خاص توانائیوں کا مالک ہوتا ہے۔ جن کے تحت وہ اقتصادی، سیاسی یا اجتماعی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو میں عدالت کے قیام کے لئے مددگار ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنی توانائیوں کو کام میں لائے اور انسانی یا اسلامی معاشرے کی زندگی کے کسی مسئلے کو حل کرے۔

مذکورہ گفتگو واضح کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی میں عورت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اجتماعی مسائل میں عورت کی شرکت کی صورتوں کے بارے میں مختلف نظریات کا اظہار کیا گیا ہے۔

کیا عورت ایک کلیدی عنصر کے طور پر عدالت کی خدمت گزار بن سکتی ہے ؟ کیا وہ اس حوالے سے کسی خاص کردار کی حامل ہے ؟ کیا اسلام عورت کے لئے ایسے کردار کو جائز سمجھتا ہے ؟

ہمارے خیال میں، اسلام نے عورت کے لئے ایسے کردار کو حرام قرار نہیں دیا ہے، کیونکہ وہ تمام افراد جو اجتماعی مسائل میں عورت کے حصہ لینے کے مخالف ہیں، وہ اس (مخالفت کے) سلسلے میں اخلاقی مسائل کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عورت کا میدانِ عمل میں داخل ہونا یا اجتماعی مسائل میں شریک ہونا، اسکے اخلاقی انحطاط کا سبب بنتا ہے۔ اور ہر ایسا عمل جس کے نتیجے میں عورت میں اخلاقی خرابی پیدا ہو، اسلام کے نکتۂ نگاہ سے حرام ہے۔

اخلاقی اقدار اور مرد وزن

نہ جانے کیوں منفی اخلاق کے پہلو کو صرف عورت ہی میں منحصر کیا جاتا ہے، لیکن مرد کے معاملے میں ایسا نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انحراف اور گمراہی کا خطرہ تو دونوں کو ایک ہی سار ہتا ہے۔ اگر باطنی غرائز (Insticts) انسان کو گمراہی کی طرف لے جاسکتے ہیں، تو بے شک (اس سلسلے میں) مرد وزن کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ دوسری طرف عقل، کوشش اور ایمان کا جوہر بھی مرد وزن میں یکساں طور پر موجود ہے۔ لہذا کوئی ایسی دلیل نہیں پائی جاتی جس کی بنیاد پر اس بے بنیاد دعوے کے ذریعے عورت کو ایک خاص کردار کے حصار میں قید کیا جائے۔

یہ دعویٰ کسی خاص فکری بنیاد کا حامل نہیں اور نہ ہی خاص اعداد و شمار کی بنیاد پر استوار ہے۔ بلکہ عورتوں کی اخلاقی خرابیوں کے مقابلے پر مردوں کی اخلاقی گمراہی بھی قابل توجہ ہے۔ البتہ اس بات پر توجہ رہنی چاہئے کہ اخلاقی خرابی صرف جنسی انحراف تک محدود نہیں ہوتی۔

بعض مواقع پر مردوں کے انحرافات عورتوں کی گمراہیوں سے بہت زیادہ ہوتے ہیں، ہر چند یہ دعویٰ دقت کے ساتھ جمع کئے گئے اعداد و شمار کی بنیاد پر استوار نہیں، لیکن ظاہراً بہت آسانی سے محسوس کیا جانے والا ہے۔ بہر حال تمام ہی امور میں اخلاقی اصولوں

کی رعایت مختلف میدانوں میں سرگرمیوں کی اساسی شرط ہے۔

لیکن کیا یہ شرط صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے 'یا اس میں مرد بھی شامل ہیں ؟

ناپسندیدہ کردار مرد کے لئے بھی ناپسندیدہ ہے اور عورت کے لئے بھی ناپسندیدہ اور اچھے اعمال کی بھی یہی صورت ہے کہ وہ دونوں کے لئے پسندیدہ ہیں۔

عزیزو ! اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ اس مشکل کی صرف جڑوں کا جائزہ لیں۔ کیونکہ مختلف نظریات کا بیان جیسے کہ مرد کی ذمے داریوں اور فرائض کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور کس طرح اسکے فرائض کی تنظیم اس انداز سے کی جا سکتی ہے کہ اس کے انحراف میں مبتلا ہونے کا راستہ روکا جا سکے ؟ یا عورت کے فرائض کے دائرے کو کس طرح متعین کیا جائے یا اسکے اجتماعی کردار کو کتنا محدود کریں تاکہ وہ اخلاقی فساد میں گرفتار نہ ہو جائے ؟۔۔۔ ان تمام باتوں پر بحث کے لئے انسانی زندگی کے تمام معاملات کی جڑوں سے شناسائی ضروری ہے۔ اس بنیاد پر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ سیاسی اور اقتصادی وغیرہ۔۔۔ جیسے میدانوں میں عورت کی سرگرمیاں حرام قرار نہیں دی گئی ہیں۔

عورت اور قیادت

پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث روایت کی جاتی ہے جس میں عورت کی سربراہی کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ اس حدیث کا متن کہتا ہے :

((لاٰ یُفْلحُ قُومْ وَلِیَتْهُم أمرأة))

((وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جس کی سربراہ عورت ہو۔))

مسلمان اور اکثر فقہا اس حدیث کو مسلمات کی صف میں قرار دیتے ہیں، جبکہ اسکی سند مکمل نہیں۔

قرآن مجید میں عورت کی سربراہی کا ذکر

یہ حدیث قرآن مجید میں عورت کی سربراہی کے ذکر سے ٹکراتی ہے۔ یہ سربراہ عورت ملکہ ٔسبا ہے۔ اگر واقعاً اسلام عورت کے کردار کو محدود کرتا ہے اور اسے قیادت کے لئے مناسب نہیں سمجھتا تو پھر کیوں قرآنِ کریم میں خداوند عالم نے ایک ایسی عورت کا تعارف کرایا ہے جو ایک سرزمین پر حکمراں ہے اور دور اندیشی اور مسائل کا سامنا کرنے کے حوالے سے جس کا طائرِ فکر مردوں سے زیادہ بلند پرواز ہے ؟ آیت میں ہے :

«قالت یا ایھا الملوا انی القی الی کتاب کریم انه من سلیمان وانه بسم اللہ الرحمن الرحیم الا تعلوا علی و اتوانی مسلمین قالت یا ایھا الملوا افتونی فی امری ماکنت قاطعة امرا حتی تشھدون۔»

«(ملکہ ٔسبا نے) کہا کہ میرے زعمائے سلطنت ! میری طرف ایک بڑا محترم خط بھیجا گیا ہے جو سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ : شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحمان اور رحیم ہے۔ دیکھو میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور اطاعت گزار بن کر چلو۔ زعمائے مملکت ! میرے مسئلے میں رائے دو کہ میں تمہاری رائے کے بغیر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتی۔» (سورۂ نمل ۲۷ - آیت ۲۹ تا ۳۲)

جیسا کہ نظر آرہا ہے، یہ عورت ایک حکمراں ہے لیکن مطلق العنان نہیں ہے' اپنی رائے ٹھونسنے والی نہیں ہے۔ جب اس کے پاس حضرت سلیمان کا خط پہنچا تو اس نے اپنی مملکت کے سرکردہ افراد کو جمع کیا اور وہ خط جو ان کے لئے ایک طرح کے انتباہ اور دھمکی کی حیثیت رکھتا تھا، ان سب کو پڑھ کر سنایا۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی تجاویز اور مشوروں سے آگاہ کریں۔ یوں اس نے عملاً بتایا کہ میں مستبد نہیں ہوں اور اپنی رائے تم

لوگوں پر مسلط کرنا نہیں چاہتی' ہر چند میں تمہاری حکمران ہوں لیکن اس موقع پر جب عوام اور مملکت کے مستقبل کا مسئلہ درپیش ہے تو لازم ہے کہ سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد سے مشورہ کیا جائے' تاکہ کوئی مناسب رائے سامنے آسکے۔

لوگوں نے اس کے جواب میں کیا کہا؟

«قالوا نحن اولوا قوة واولوا باس شديد والامر اليک فانظری ماذا تامرين-»

«ان لوگوں نے کہا کہ ہم صاحبانِ قوت اور ماہرینِ جنگ و جدال ہیں اور اختیار بہر حال آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ بتائیں کہ آپ کا حکم کیا ہے۔»

(سورہ نمل ۲۷۔ آیت ۳۳)

ان لوگوں نے ملکۂ سبا کی خدمت میں اپنی جسمانی طاقت پیش کی، لیکن اس وقت اسے ان کی جسمانی قوت کی ضرورت نہ تھی بلکہ اس موقع پر وہ ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہتی تھی۔

یوں جب قوم کے سرکردہ افراد نے معاملہ اسی کے ہاتھ میں دے دیا' تو وہ موقف کے تعین کے لئے اضطراب و پریشانی کے عالم میں سوچ بچار میں غرق ہو گئی اور کچھ دیر بعد کہا:

«ان الملوک اذا دخلوا قرية افسدوها و جعلوا اعزة اهلها اذلة و كذٰلک يفعلون' وانی مرسلة اليهم بهدية فنا ظرة بم يرجع المرسلون-»

«جب بادشاہ کسی علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو اسے ویران کر دیتے ہیں اور وہاں کے صاحبانِ عزت کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا یہی طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اور میں ان کی طرف ایک ہدیہ بھیج رہی ہوں اور پھر دیکھتی ہوں

کہ میرے نمائندے کیا جواب لے کر آتے ہیں۔»

(سورہ نمل ۲۷۔ آیت ۳۴۔۳۵)

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، ملکۂ سبا ایک معاملہ فہم خاتون ہے' وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ سلیمان' خدا کے نبی ہیں یا ایک بادشاہ؟

اگر وہ بادشاہ ہوئے تو اپنے لئے ایک علیحدہ طرز عمل کے متقاضی ہوں گے اور اگر خدا کے نبی ہوئے تو مسئلے کو ایک دوسری نظر سے دیکھا جانا چاہیے۔ اسی سوچ کے ساتھ ملکۂ سبا نے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں تحفہ ارسال کیا۔

حضرت سلیمانؑ بھی اس قصے کو انجام تک پہنچانا چاہتے تھے، جب وہ تحفہ ان کی خدمت میں پہنچا اور کچھ مدت بعد ملکۂ سبا کو حضرت سلیمانؑ کی خصوصیات کا علم ہو گیا اور ایک عرصے تک ان کی حکومت کے زیر سایہ رہی۔ بجائے یہ کہ وہ ایک متعصب عورت کی مانند اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنی موروثی بادشاہت کا دفاع کرتی' حضرت سلیمان سے جنگ کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی، اس نے حقیقت کو جان لیا اور اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ کہا کہ :

«اسلمت مع سلیمان للہ رب العالمین۔»

«اب میں سلیمان کے ساتھ اس خدا پر ایمان لے آئی ہوں جو عالمین کا رب ہے۔» (سورۂ نمل ۲۷۔ آیت ۴۴)

قرآن کریم میں، کس غرض سے اس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے؟

یہ داستان، کوئی حکمِ شرعی بیان نہیں کر رہی، لیکن اس میں ایک پسندیدہ مفہوم موجود ہے۔ اور وہ مفہوم یہ ہے کہ عورت بھی، مرد ہی کی مانند ترقی کر سکتی ہے اور طبیعی انداز میں ایک امت کی قیادت سنبھال سکتی ہے۔

البتہ اس مقام پر ہم اس مسئلے کا قطعی حکم بیان نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ مسئلہ وسیع ترین

تحقیق کا متقاضی اور بہت زیادہ مہارت کا طالب ہے۔ اگرچہ اس قسم کی مثال کا اسلامی تاریخ میں سراغ نہیں ملتا لیکن در حقیقت، عورت کا اصل چہرہ یہی ہے۔

ہماری یہ گفتگو عورت کی سربراہی کے مسئلے پر تھی، لیکن دوسرے تمام مناصب پر بھی عورت بہت سی کلیدی ذمے داریوں پر فائز ہو سکتی ہے۔ بالخصوص جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے حالات اور نتیجے کے طور پر حکم، گزشتہ زمانے سے بہت زیادہ مختلف ہو چکے ہیں۔

گزشتہ زمانے میں بھی، عصر حاضر کے کچھ نظائر کی مانند کلیدی عہدوں کے ذمے دار افراد معاملات کے بارے میں کسی سے مشورت نہیں کرتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں کلیدی عہدوں پر فائز افراد مشورت کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرتے ہیں اور اپنے پروگرام کو جامۂ عمل پہناتے ہیں۔ لیکن یہ افراد دوسروں کی آراء و نظریات کو قبول کرنے، یا مسترد کرنے کے سلسلے میں آزاد ہوتے ہیں۔

لہذا اگر ہم عصرِ حاضر کی حکومت کے مسائل کا جائزہ لینا چاہیں تو اس دوران ہمیں گزشتہ زمانے کے حکمرانوں کے اندازِ حکمرانی کو اپنے ذہن میں بٹھالے نہیں رہ جانا چاہئے، کیونکہ اس دور میں صرف ایک شخص فیصلہ کرتا تھا، لیکن آج کے دور میں اجتماعی فیصلوں کے سامنے فردِ واحد کا فیصلہ اپنا رنگ کھو دیتا ہے۔ عورت کے انتظامی سربراہ ہونے کا جائزہ لیتے ہوئے بھی اس مسئلے پر توجہ مرکوز رہنی چاہئے کہ عورت کا حکم مختلف آراء کا ضمیمہ اور ان میں جمع ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عورت کو مسائل و معاملات میں مکمل اختیار اور مطلق العنانی حاصل ہے۔

اب اس مفروضے کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچئے کہ کیا موجودہ شرائط میں دینِ مبینِ اسلام کلیدی عہدے پر عورت کے فائز ہونے کا مخالف ہے؟

لہذا (اگر بالفرض اس حدیث کی سند درست ہو تب بھی) عورت کی قیادت کے

مسئلے کا اس طرح جائزہ لئے بغیر جیسے کہ پیغمبرؐ کے پیش نظر تھا مذکورہ حدیث رسولؐ کو ایک قطعی حکم کے طور پر قبول نہیں کی جاسکتا۔

البتہ موجودہ حالات و شرائط اور زمانے کی تبدیلی کے پیش نظر عورت کی قیادت کے مسئلے نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس بنیاد پر ہمارا خیال یہ ہے کہ عورت بھی مرد ہی کی مانند، اسلام کے سیاسی نظام میں ایک متعین کردار کی مالک ہے۔ لیکن اسکی کچھ جزیات مرد کے کردار سے مختلف ہیں، اور اسکے بر عکس بھی صادق ہے کہ مرد کے کردار کی جزیات بھی عورت کے کردار سے مختلف ہیں۔

ایک متحرک سماج میں مرد وزن کی تصویر

ایک متحرک سماج میں سیاسی، اجتماعی اور عسکری مسائل میں مرد وزن کے درمیان دوئی نہیں۔ بالفاظ دیگر ایک متحرک اسلامی معاشرہ، ایسا معاشرہ نہیں ہے جس میں عورت مرد سے جدا ہو اور ہر ایک نے اپنی اپنی راہ لی ہوئی ہو۔ بلکہ ایسے معاشرے میں در حقیقت مرد وزن باہمی تعاون واشتراک کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

«والمومنون والمومنات بعضهم اولياء بعض يا مرون بالمعروف و ينهون عن المنكر----»

«مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں سب ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں کہ یہ سب ایک دوسرے کو نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں۔» (سورۂ توبہ ۹- آیت ۷۱)

اس بنیاد پر، ہم ایک دوسرے کے مددگار اور شریکِ کار ہیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ اس آیۂ شریفہ میں «اولیاء» سے مراد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مرد وزن منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے جد و جہد (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کے لئے ایک دوسرے کے مددگار، معاون اور مشاور ہیں۔

خداوندِ عالم نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا ہے کہ (صرف) مومن مرد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ یا (صرف) مومن عورتیں اس ذمے داری کو ادا کریں۔ بلکہ فرمایا ہے کہ یہ دونوں (مومن مرد اور مومن عورتیں) ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔ اور ایک ہی جماعت کی صورت میں زندگی بسر کرتے ہیں' ایک ہی راستے پر چلتے ہیں، سب کا نصب العین ایک ہی ہے، اور اس بنیاد پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

ظالم حکمرانوں کے مقابل عورت کا کردار

اسلام کے دو حیات بخش عنصر، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بے شک ہر مسلمان کی ذمے داری ہیں اور انہیں معاشرے کے تمام پہلوؤں اور شعبوں میں ملحوظ رکھا جانا چاہئے۔

عدالت کے مسئلے میں معروف کے پسندیدہ مظاہر عادل حکمراں' عدالت پر مبنی قانون اور عادلانہ روابط و تعلقات ہیں۔ جبکہ مذموم ظالمانہ طرزِ عمل میں منکر کے ناپسندیدہ مظاہر ظالم حکمراں' مظلوموں پر ظلم و ستم' ظالمانہ قانون اور روابط و تعلقات میں ظلم وغیرہ شمار کئے جاسکتے ہیں۔

یہ دو عناصر اس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ امام حسینؑ انہیں اپنے قیام و تحریک کا عنوان قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

«انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی اریدان امر بالمعروف و انهی عن المنکر»

«میں تو صرف اپنے جد کی امت کی اصلاح کے لئے نکل رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ (لوگوں کو) نیکیوں اور اچھی باتوں کی طرف بلاؤں اور (انہیں) برائیوں اور برے کاموں سے روکوں۔»

اس نفیس کلام کی روشنی میں باآسانی پتا چلایا جا سکتا ہے کہ حکمرانوں کے ظلم و ستم کے خلاف جدو جہد' ظالمانہ روابط اور ظالمانہ سیاسی اور اجتماعی مسائل کے خلاف قیام اور اسلام مخالف قوانین کے خلاف جنگ، یہ تمام کی تمام چیزیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سے ہیں۔ یہاں تک کہ ظالم حکومت سے نجات کے لئے عوام کا اٹھ کھڑے ہونا بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شمار ہوتا ہے۔

لہذا مرد وزن، دونوں کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ، دوش بدوش، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنی چاہئے اور عدل وانصاف کے قیام کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ اسی بنا پر ہم بھی کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا صریح فرمان اس مسئلے پر بھرپور تاکید کا حامل ہے۔

قرآنِ کریم کا یہ جملہ کہ «مسلمان ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں» بخوبی واضح کرتا ہے کہ اسلامی معاشرے کو باہمی میل جول اور باہمی تعاون جیسی خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے۔ ہر چند لغات (Dictionaries) میں، ان کلمات کے لئے محض چند ہی معنی مل سکیں لیکن قرآن کریم سے بہت آسانی کے ساتھ ان الفاظ کا حقیقی مفہوم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کلمات کا دائرہ انسان کی تمام انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم اسلامی معاشرے کو ایک بند معاشرہ تصور نہیں کر سکتے بلکہ اسلامی معاشرہ ایک کھلا اور آزاد معاشرہ ہے۔

البتہ اس بات میں شک نہیں کہ اسلامی معاشرے کے کھلے ہونے کی حدود، اخلاقی اقدار کی سرحدیں عبور نہیں کرتیں۔ کیونکہ اسلام کے تمام ارکان ایک دوسرے سے مربوط اور ایک پیکرِ واحد ہیں۔ لہذا اگر ہم اسلام کے کسی ایک پہلو یا اسکے کسی ایک مسئلے پر گفتگو کریں تو بے گمان اس کے ہمراہ بہت سے دوسرے پہلو اور مسائل بھی بیان ہوں گے۔ لہذا ہمیں ان میں سے ہر ایک مسئلے کے علیحدہ علیحدہ جائزے کی ضرورت نہیں۔ اس بنیاد پر ہماری یہ گفتگو اسلامی سیاست میں عورت کے ایک مجموعی کردار یا مجموعی طرزِ عمل

کی نشاندہی کرتی ہے۔

مرد وزن دونوں اسلامی اقدار کے مخاطب ہیں

اس موقع پر ایک انتہائی اہم نکتے کی جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں جن اقدار کی جانب اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے کوئی ایک قدر (Value) بھی ایسی نہیں جو تمام انسانوں کے لئے نہ ہو، ہر چند اسے بیان کرتے ہوئے جمع مذکر سے کام لیا گیا ہو۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے :

«قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون-»

«کہہ دیجئے کہ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان (لوگوں) کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے ہیں۔ (سورۂ زمر ۳۹-آیت ۹)

اس آیۂ کریمہ کو سامنے رکھ کر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآنِ کریم جاننے والے یا نہ جاننے والے مردوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ بلکہ قرآنِ مجید کا روئے سخن جاننے اور نہ جاننے والے تمام انسانوں کی طرف ہے۔ اس آیت کی مراد تمام انسان ہیں اور یہ صرف مردوں سے مخصوص نہیں۔ کیونکہ گوہرِ علم تمام انسانوں کے لئے باعثِ فضیلت ہے۔ اسی طرح ارشادِ الٰہی ہے :

«افمن كان مومنا كمن كانا فاسقا لا يستوون-»

«کیا وہ شخص جو صاحبِ ایمان ہے، اسکی مثل ہو جائے گا جو فاسق ہے، ہرگز نہیں، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔» (سورۂ سجدہ ۳۲-آیت ۱۸)

یا یہ ارشادِ الٰہی کہ :

«افنجعل المسلمين كالمجرمين-»

«کیا ہم اطاعت گزاروں سے بھی مجرموں جیسا برتاؤ کریں۔»

(سورۂ قلم ۶۸-آیت ۳۵)

ان آیات کو دیکھ کر، کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومن مرد تو فاسق مرد کے برابر نہیں ہو سکتا البتہ مومن عورت فاسق عورت کے برابر ہے ؟!!!

کیا عقل اس بات کو قبول کر سکتی ہے ؟

اور

کیا عالم عورت، جاہل و نادان عورت کے برابر ہے ؟

اس قسم کے سوالوں کا جواب، اظہر من الشمس ہے۔ دنیا میں انسانوں سے تعلق رکھنے والی کوئی ایک قدر (Value) بھی ایسی نہیں جس میں مرد و زن دونوں شریک نہ ہوں۔

عورت کی فکری و ذہنی صلاحیت

اسی طرح عورت سے متعلق امور کو ایک دوسرے زاویے (Angle) سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ زاویہ بعض لوگوں کے اس دعوے پر مبنی ہے کہ عورت اور مرد میں عقل و شعور کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔ عقل ہر فرد کی ذمے داریوں اور فرائض کا تعین کرنے والا عامل ہے اور خداوند عالم نے مرد کو عورت پر عقلی، فکری اور عملی برتری کی بنا پر فوقیت دی ہے۔

اس گروہ کے جواب میں کہنا چاہئے کہ اگر واقعاً عورت کی عقل، مرد کی عقل سے کم تر ہوتی تو ان کی تکلیف (اور فریضہ) بھی ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ ہم شاہد ہیں کہ سوائے گھریلو مسائل اور جہاد کے مرد و زن کے درمیان تمام تکالیف مشترک ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اس بات میں بھی شک نہیں کہ تکالیف کی انجام دہی کے لئے کوشش، ارادہ، فکر و شعور اور ان سب سے اہم تر «عقل» کی ضرورت ہے۔ اسی بنا پر ہم

کہتے ہیں کہ خداوند عالم کی طرف سے عائد کئے گئے تمام فرائض مرد وزن پر مشترکہ طور پر عائد ہوتے ہیں۔

دوسری طرف 'اگر واقعاً عورت کا عقل وادراک مرد سے کم تر ہوتا (جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے) تو بے شک عورت کی تکالیف اور فرائض بھی مرد سے کم تر ہوتے۔ لیکن اسلام نے عورت اور مرد کی تکالیف کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں رکھا ہے' سوائے ان کچھ موارد کے جو ان دونوں کی مخصوص صفات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ہی موارد میں سے وہ فرائض ہیں جنہیں خداوند عالم نے گھرانے کی تنظیم اور ترقی کے لئے ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کے ذمے عائد کیا ہے۔ ممکن ہے ہم اس نشست میں ان پر بھی گفتگو کریں۔

البتہ اس بارے میں کچھ بے بنیاد باتیں بھی کہی جاتی ہیں، جن پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں' جیسا کہ لوگوں کے درمیان کہا جاتا ہے کہ فلاں کی عقل فلاں دوسرے سے زیادہ ہے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

اگر اس موضوع کا علمی انداز سے جائزہ لیا جائے تو دیکھیں گے کہ مرد وزن میں سے ہر ایک اپنی عقل ودرک وفکر سے ہم آہنگ فریضے کے حامل ہیں اور قیامت میں بھی لوگوں کا ان کی عقلی سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے حساب کتاب کیا جائے گا۔ لہذا کبھی کسی ایک خاص مورد میں ایک عورت کی ذہنی صلاحیت ایک مرد سے زیادہ ہوتی ہے اور کبھی ایک مرد کی ذہنی صلاحیت ایک عورت سے زیادہ۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں ہی عقلی لحاظ سے ایک سطح پر ہوتے ہیں۔ پس مجموعی طور پر عورت کی عقل کو مرد سے کم تر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ اسلام نے (سوائے چند جزی اور فروعی مسائل کے) ہرگز

مرد اور عورت کی حیثیت اور ان کی ذمے داریوں میں فرق نہیں رکھا ہے۔ لیکن ہنوز عورت کی حقیقی حیثیت معاشرے میں ظاہر نہیں ہوئی ہے اسی طرح جیسے مرد بھی ابھی تک معاشرے میں اپنی اصل حیثیت اور مقام سے بہت دور ہے۔

معاشرہ اور بگاڑ

معاشرے میں کچھ ایسے موارد نظر آتے ہیں جن کا دائرہ مرد وزن دونوں پر محیط ہے۔ یہ موارد وہ گمراہیاں اور بگاڑ ہیں جن میں انسان مبتلا ہیں۔ یہ وہ موارد ہیں جو انسان کی سرگرمیوں کو سست کرتے ہیں اور آزادی اور عدالت کی جانب اسکے سفر میں رکاٹ ہیں۔

در حقیقت وہ معاشرہ، جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں' ایک حقیقی اسلامی معاشرہ نہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ راستہ جسے ہمارے معاشرے نے اپنایا ہے' وہ واقعی معنوں میں ایک اسلامی راستہ نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا معاشرہ اسلام کی صرف بعض تعلیمات پر کاربند ہے جبکہ اس کے پہلو بہ پہلو بہت سے موارد میں اس میں کفر کے نشانات بھی نظر آتے ہیں۔ اس بنیاد پر ہمارا معاشرہ ایک مخلوط معاشرہ ہے۔ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں دین کے ساتھ کفر (کے بعض مظاہر) کی آمیزش بھی ہے۔ لوگوں کے قلب، عقل اور عمل میں کفر' دین کے ہمراہ گھر کئے ہوئے ہے۔ گویا لوگ ان دونوں کی آمیزش سے بننے والی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس بنا پر بہت سے مفاہیم جن پر ہم عادتاً یا انہیں غلط طور پر درست سمجھتے ہوئے کاربند ہیں، وہ مرد وزن کے انحرافات کی بنیاد بنتے ہیں۔

بگاڑ کے مقابل ایک مسلمان کا کردار

ہمیں اپنے کردار و عمل کی تعمیر اسلامی بنیادوں پر کرنی چاہئے اور ان بنیادوں کو ان کے اصل بر چشموں سے حاصل کرنا چاہئے' تاکہ ان کے اصل رمز و راز کو جان

سکیں۔ اپنی زندگی کی راہ و روش میں بھی ان بنیادوں کو اپنے سامنے رکھیں۔ صرف اسی صورت میں ہم اسلام کی اصل تعلیمات کو جامۂ عمل پہنا سکتے ہیں اور منحرف اور گمراہ افراد کے سامنے ڈٹ کر جمے رہ سکتے ہیں' ان گمراہ افراد کے مقابل جنہوں نے حقیقی مفکرین کو اپنے حملوں کی زد پر لیا ہوا ہے اور کوشاں ہیں کہ ان کی اصیل فکر کو اپنے حملوں تلے روند کر ختم کر دیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ تمام حربوں مثلاً تہمت و افتراء اور ناسزا گوئی سے کام لیتے ہیں۔

البتہ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ ہم مخالف تحریکوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور ایک مکمل اسلامی معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں' جس میں مرد و زن اپنے کمال کی بلندیوں کو پہنچ سکتے ہیں' اس طرح کہ ہمیشہ ایک دوسرے کے دوش بدوش پورے کرۂ عرض پر اہل دنیا کو خیر و خوبی کی طرف دعوت دیں اور انہیں برائیوں سے باز رکھیں۔

لازماً ایک روز اسلام مرد و زن کے باہمی تعاون اور کوششوں سے اپنے ارفع مقاصد تک اوج حاصل کر لے گا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆

ہماری مطبوعات

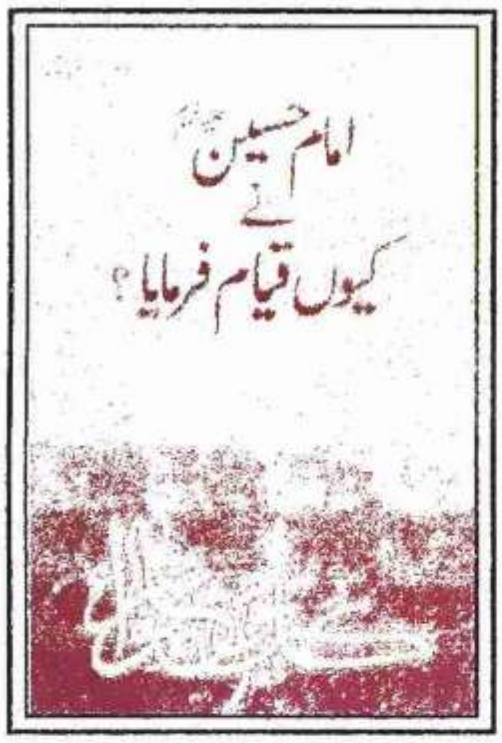

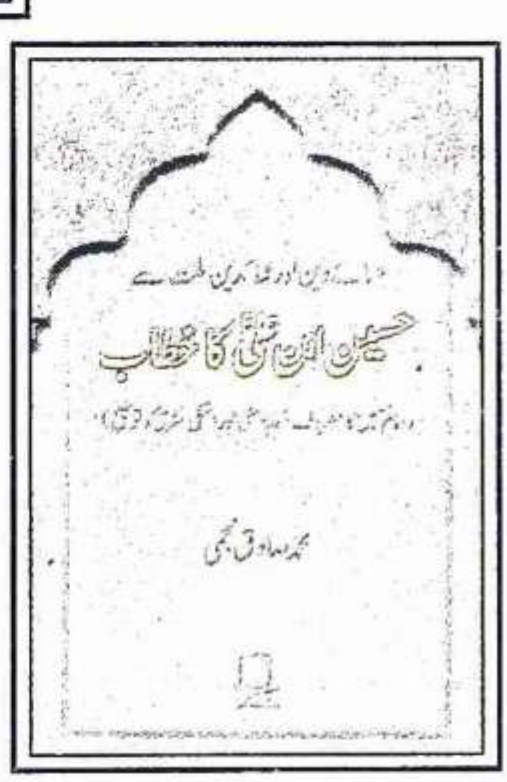

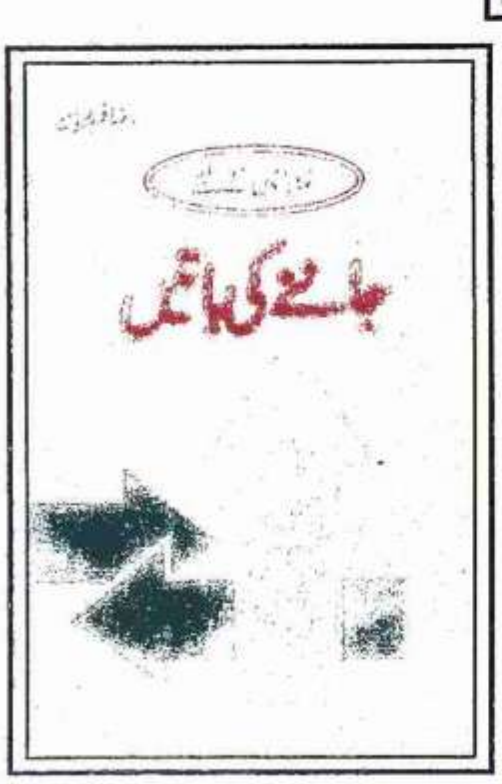

دار الثقلین